ابنِ انشا

یادیں باتیں
بہار خزاں

اے حمید

ابنِ انشاء

- یادیں
- باتیں
- بہار
- خزاں

اے حمید

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز
لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : غلام علی پرنٹرز
جامعہ اشرفیہ، اچھرہ، لاہور

مقام اشاعت :
شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

شکیلہ ناہید کے نام

یہ کتاب زمانے کے سٹیج پر سے جس عہد کا پردہ اٹھاتی ہے اس کے شب و روز تمہاری دوستی اور خلوص کے سدا بہار پھولوں سے مہک رہے ہیں۔ جن دنوں کی یہ داستان ہے حقیقت میں وہ ہمارے لازوال خلوص اور محبت کا دَور تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس سٹیج کے کردار اپنا اپنا رول ادا کر کے جھک کر رخصت ہو رہے ہیں لیکن ہماری دوستی اور رفاقت کے سُرخ گلاب آج بھی پہلے دن کی طرح شگفتہ و تر و تازہ ہیں۔

اے حمید

لاہور - فروری

۱۹۶۹

بات اتنی پرانی بھی نہیں ہے۔

یہی سن ۱۹۴۷ء کی ایک دوپہر تھی کہ ہم لوگ امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آ گئے۔ شاہ عالمی دروازے کی راکھ میں سے ابھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ مسجد شہید گنج میں چھپے ہوئے سکھ ابھی تک ریلوے سٹیشن کے باہر مہاجرین کیمپ پر فائرنگ کر رہے تھے۔ لاہور شہر کی فضا جلے ہوئے مکانوں کی بُو سے بوجھل تھی۔ والٹن کے مہاجرین کیمپ میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مشرقی پنجاب سے مسلمان پناہ گیروں کی ریل گاڑیاں دھڑا دھڑ لاہور پہنچ رہی تھیں۔ ادھر سے ہندو سکھ شرنارتھیوں کے قافلے مشرقی پنجاب کی طرف جا رہے تھے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ایک انتشار ایک اداسی طاری تھی۔ امرتسر، جالندھر، لدھیانہ اور مشرقی پنجاب کے دوسرے دیہات سے جو مسلمان بھی لاہور پہنچا زخم خوردہ تھا۔

ہم امرتسر کے ادیب شاعر دوست پہلے گوالمنڈی کے ایک ہوٹل میں بیٹھا کرتے تھے۔ پھر وہاں سے مال روڈ پہ پاک ٹی ہاؤس میں آ کر ڈیرا جما لیا۔ پاک ٹی ہاؤس کا نام پہلے، انڈیا ٹی ہاؤس ہوا کرتا تھا۔ اس ٹی ہاؤس کی روشن روشن چمکیلی فضا میں ہم نے باہر سے آئے ہوئے دوستوں کو پہلی بار دیکھا۔ کسی نے کہا۔

"میرا نام اشفاق احمد ہے۔"

کسی نے کہا۔

"مجھے ناصر کاظمی کہتے ہیں۔"

"میں اے حمید ہوں۔ تم سب سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

اور پھر ایک روز میں نے ابن انشاء کو دیکھا۔

دبلا سانولا، لہریالے چمکیلے بال اور ناک پر موٹے شیشوں کی عینک —— پہلی بار دیکھنے پر مجھے وہ کسی ہندو ساہوکار کا منیم جی لگا۔ میرا حمید اختر نے تعارف کروایا۔

"ہمارا یار غار اور ترقی پسند ادیب ابن انشاء۔"

میں نے انشاء سے ہاتھ ملایا۔ وہ شرما سا گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بڑی ذہین اور شریر چمک سی آگئی۔ اب وہ مجھے ایک بے حد شرارتی اور نٹ کھٹ لڑکا لگا اور مجھے اس سے مل کر خوشی ہوئی۔ حمید اختر بولا۔

"اے حمید! تمہیں ابن انشاء سے مل کر بہت خوشی ہوگی، کیونکہ تمہاری طرح یہ بھی کبھی کبھی چڑیوں، طوطوں کی باتیں بڑے مزے لے کر کرتا ہے۔"

ابراہیم جلیس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"ارے کمینے یہ اندر سے شیر محمد قیصر ہے۔"

حمید اختر بولا۔

"اور صحرائی بھی۔"

ابراہیم جلیس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ ابن انشاء نے بڑے بھولپن سے سر ہلاتے اور عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"دوستو! میں ابن انشاء ہوں لیکن چائے کا آرڈر کون دے رہا ہے؟"

احمد راہی کہنے لگا۔

"یہ جلیس بڑے اونچے اونچے قہقہے لگاتا ہے اسے پکڑنا چاہیے۔"

حمید اختر نے جلیس کی گردن پکڑ کر کہا۔

"منگواؤ کمینے چائے۔"

ابراہیم جلیس نے گردن جھکا کر ہنستے ہوئے کہا۔

"چائے کا آرڈر میں دیتا ہوں مگر پیسٹری ابن انشاء منگوائے گا۔"

ابن انشاء شیشے صاف کر کے عینک ناک پر جما رہا تھا۔ اس کے نچلے ہونٹ کے کونے میں شرارت بھری مسکراہٹ کی لکیر ابھری۔ کہنے لگا۔

"دوستو! میرا یہ تجربہ ہے کہ میں نے جب بھی ٹی ہاؤس میں پیسٹری منگوائی باسی آئی۔ ہاں ساتھ والی میز پہ ناصر کاظمی بیٹھا ہے۔ اس کا ادھار بھی چلتا ہے اور بیرے اسے تازہ پیسٹری لا کر دیتے ہیں۔"

ناصر کاظمی نے آخری سگریٹ کا آخری کش لگایا اور ساتھ والی میز سے اٹھ کر ہماری میز پر آگیا۔ ابن انشاء کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"پیارے میں تو چائے کے ساتھ انناس کھایا کرتا ہوں لیکن تمہاری خاطر سارے لاہور شہر کی پیسٹری منگوا سکتا ہوں۔"

پھر اس نے ٹی ہاؤس کے بیرے لال کو بلا کر کہا۔

"لال! میرے دوستوں کو عمدہ پیسٹریاں لا کر کھلاؤ۔"

پھر میں نے محسوس کیا کہ ابن انشاء فضول خرچ بالکل نہیں تھا بلکہ وہ ہر خرچ کو فضول سمجھتا تھا۔ بڑا کم خرچ تھا لیکن بالا نشیں تھا۔ اس کے دوست اس کو بہت چاہتے تھے۔ جلد ہی ہمارا ایک ترقی پسند گروپ بن گیا۔ حمید اختر، ابراہیم جلیس، کرمانی، سبط حسن، احمد راہی، عارف عبدالمتین، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، احمد ندیم قاسمی، عبداللہ ملک اور دوسرے احباب نے مل کر انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی۔ ہر ہفتے اس کے ادبی اجلاس ہونے لگے۔ افسانے، مضامین اور غزلیں نظمیں پڑھی جاتیں۔ زوردار بحثیں ہوتیں۔ ابن انشاء ان بحثوں میں بھرپور حصہ لیتا۔

ان ہی دنوں ابن انشاء نے اپنی مشہور طویل نظم "بغداد کی رات" لکھی اور

انجمن کے اجلاس میں پڑھی۔ اس پر بحث شروع ہو گئی۔ ابن انشاء انجمن کے اصول وضوابط کے مطابق اس بحث میں حصّہ نہیں لے سکتا تھا۔ چنانچہ وہ میرے ساتھ کرسی پر بیٹھا پہلو بدلتا رہا۔ اسلوب کے اعتبار سے یہ نظم اُس عہد کی ترقی پسند نظموں سے بہت مختلف تھی۔ بیان بڑا سادہ تھا۔ اظہار کچھ اس طرح کے خیالات کا تھا کہ جو اس زمانے کی ترقی پسند تحریک سے ذرا ہٹ کر تھے۔ بہر حال بحث جاری رہی سہ

کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرہ تیرا

مجھے ابن انشا کی یہ نظم بڑی پسند آئی۔ شاید اس لیے کہ میں خود بغداد کی راتوں کا مسافر تھا اور الف لیلیٰ کی شہزادیوں سے عشق کیا کرتا تھا۔ میں ابن انشاء سے پیار کرنے لگا اور یہی اُس سے میری دوستی کا آغاز تھا کیونکہ میں دوستی نہیں کر سکتا، پیار کر سکتا ہوں اور میں ابن انشاء سے پیار کرنے لگا۔ اب مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ بھی مجھ سے پیار کرتا ہے۔

ان دنوں ابن انشاء ایبٹ روڈ پر نشاط سینما کے سامنے والے ایک چھوٹے سے سُرخ مکان میں رہتا تھا۔ یہ مکان انہوں نے پھلور سے آنے کے بعد الاٹ کروا لیا تھا۔ اس مکان کی چھت آگے کی جانب ڈھلانی تھی اور سُرخ تھی۔ ابراہیم جلیس اس مکان کو چینی پگوڈا کہا کرتا تھا۔ مکان کے آگے ایک ننھا سا آنگن تھا۔ آنگن میں پیپل کے پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں رہتی۔ میں اور انشا برآمدے میں بیٹھے باتیں کیا کرتے۔ وہ آئینہ میز پر رکھے کھرچ کھرچ کر شیو بنا رہا ہوتا۔ اندر سے چائے کی دو پیالیاں آجاتیں۔

"اے حمید! لاہور کی گلیاں بغداد کی گلیوں سے بڑی ملتی جلتی ہیں۔"

میں نے کہا۔

"تم نے بغداد کی گلیاں کہاں دیکھی ہیں؟"

ابن انشاء نے سر ہلا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایک نہ ایک دن بغداد کی گلیاں ضرور دیکھوں گا۔"

پھر وہ تولیے سے گال رگڑتے ہوئے پوچھتا۔

"تم نے نیا چینی رسالہ 'نیو ٹائمز' پڑھا؟"

"نہیں تو۔"

"ابھی لاتا ہوں۔"

اندر سے وہ 'نیو ٹائمز' کا رسالہ اٹھا لایا اور ہم مل کر اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ چائے پیتے ہوئے وہ مجھ سے باتیں کرنے لگا۔

"اے حمید! تم رومانٹک ہو۔ تمہیں سیاسی شعور بھی ضرور ہونا چاہیے۔ میں چاہتا ہوں تم 'نیو ٹائمز' باقاعدگی سے پڑھا کرو۔ پھر جب تم کہانیاں لکھو گے تو وہ تمہاری یادگار کہانیاں ہوں گی۔"

میں نے 'نیو ٹائمز' کا رسالہ بند کر کے ابن انشاء کے کان میں کہا۔

"ریحانہ کا ایک اور خط آیا ہے۔"

ابن انشاء کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔

"کہاں ہے کمینے۔ لا مجھے بھی پڑھ کر سُنا۔"

"میں اپنی محبوبہ کا خط تمہیں کیوں سناؤں؟"

ابن انشاء نے چوکور آئینہ برآمدے کے ستون سے لٹکا دیا اور بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے بولا۔

"کمینے! مجھ سے اپنی محبت کے بارے میں مشورہ نہیں لوگے تو کیا حمید اختر اور سبطِ حسن سے لوگے؟ چلو میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم اپنے محبت بھرے خطوط میں میری نظم 'بغداد کی ایک رات' کے شعر استعمال کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا۔

"میں اپنی محبوبہ سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتا۔"

ابن انشاء اپنی شرارت بھری چمکیلی آنکھیں جھپکا کر بولا۔

"پھر کیا ہوا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ وہ تمہیں چھوڑ کر مجھے خط لکھنے شروع کر دے گی۔ ویسے بھی وہ بے چاری تمہارے لمبے لمبے رومانٹک افسانے کب تک سنتی رہے گی۔ میں اسے چھوٹی چھوٹی پیاری پیاری نظمیں سنایا کروں گا۔ فکر نہ کرو۔ کبھی کبھی تمہارے افسانوں کا ذکر بھی کر لیا کریں گے۔"

میں نے ریحانہ کا خط نکال کر ابن انشاء کو دیا۔ وہ کھول کر پڑھنے لگا۔ اس کے ابرو کبھی اوپر اٹھتے کبھی نیچے گرتے۔ عینک کے پیچھے چمکیلی آنکھیں لفظوں کا تعاقب کرنے لگیں۔

"ارے یہ خط جعلی تو نہیں! مجھے تو یہ تمہاری کارستانی معلوم ہوتی ہے۔"

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"ریحانہ کے خط بڑے رومانٹک ہوتے ہیں۔ تمہیں اس لیے شک ہوا۔ نیچے دیکھو اس کا نام لکھا ہوا ہے۔"

ابن انشاء نے خط کے نیچے ریحانہ کے دستخط بڑے غور سے دیکھے۔

"ریحانہ کے دستخط تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ یا تو یہ خط تم نے خود لکھا ہے اور یا پھر ریحانہ کو تم خود لکھ کر دیتے ہو۔"

میں ہنس پڑا۔ ابن انشاء بھی مسکرایا۔ پھر میری طرف گردن جھکا کر کہنے لگا۔

"کمینے کیوں شریف بیبیوں کو خراب کر رہے ہو۔ اچھا میں اس لڑکی سے ملوں گا۔ کہوں گا۔ بی بی! یہ امرتسری بدمعاش تو بیک وقت چار لڑکیوں سے عشق کر رہا ہے۔ اٹھیں تو ابھی کوالٹی ریسٹورنٹ میں چل کر مجھے فروٹ کیک کھلاؤ۔"

میں نے ابن انشاء کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"منظور ہے"

کوالٹی ریسٹورنٹ میکلوڈ روڈ پر ریجنٹ سینما کے بالکل سامنے ہوا کرتا تھا۔

بعد میں یہاں موٹروں کا شو روم کھل گیا۔ اب وہ بھی نہیں رہا۔ اس ریسٹورنٹ کی بہار تھوڑے دن ہی رہی۔ اس ریسٹورنٹ میں کوئی خاص بات بھی نہیں تھی۔ لیکن کچھ عرصہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی منڈلی اس ریسٹورنٹ میں اپنی محفل جماتی رہی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ یہ نیا نیا کھلا تھا۔ اس ریسٹورنٹ میں اتری ہوئی میری ایک تصویر آج بھی میرے پاس ہے جس کے نیچے ابن انشاء نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا "نٹ کھٹ اے حمید"

ابن انشاء کپڑے پہن کر تیار ہوا تو ہم ایبٹ روڈ پر آ گئے۔

"ذرا حسرت صاحب کو دیکھتے چلتے ہیں۔ شاید کرمانی بھی آ گیا ہو۔"

روزنامہ 'امروز' کا دفتر ان دنوں ایبٹ روڈ پر ہوا کرتا تھا اور ابن انشاء کے مکان کے بالکل سامنے تھا۔ ہم امروز کے دفتر میں آ گئے۔ چراغ حسن حسرت ابھی تشریف نہیں لائے تھے۔ ہم نے چق اٹھا کر دیکھا ان کا کمرہ خالی تھا۔ اس دفتر کے پہلو میں کسی ٹرانسپورٹ کمپنی کا دفتر تھا اور باہر ایک آدھ ٹرک اکثر کھڑا رہتا اور کلینر وغیرہ چھوٹی موٹی مرمتوں میں لگے رہا کرتے تھے۔ ٹرانسپورٹ کمپنی کے مینجر کا دفتر حسرت صاحب کے کمرے کے برابر میں تھا اور اس کے آگے بھی چق پڑی رہتی تھی۔

ایک روز ایسا ہوا کہ ایک نو وارد کلینر کو ڈرائیور نے کہا کہ مینجر سے جا کر ٹائر کی پرچی لے آئے۔ کلینر کو ابھی دفتر کے نشیب و فراز کا علم نہیں تھا۔ اس نے مینجر کے دفتر میں جانے کی بجائے حسرت صاحب کے دفتر کی چق اٹھائی اور اندر آ گیا۔ سامنے میز پر ٹیبل لیمپ جلائے حسرت صاحب کالم لکھ رہے تھے۔ کلینر نے ایک لحیم و شحیم مونچھوں والے آدمی کو دیکھا تو سمجھ گیا کہ یہی مینجر ہے۔ اب حسرت صاحب کو بھی کسی نو وارد کی موجودگی کا احساس ہوا۔ چشمے کے پیچھے سے اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھیں اٹھا کر پوچھا۔

"فرمائیے مولانا! میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

کلینر نے ٹھیٹھ پنجابی لہجے میں کہا۔

"جی کرم داد ڈرائیور چھبی اختق نے نیا ٹائر مانگا ہے۔"

حسرت صاحب چونکے۔ ایک ہاتھ سے چشمہ اتارا اور بولے۔

"کیا فرمایا مولانا؟"

کلینر نے بالکل ویسے ہی انداز میں پھر کہا۔

"جی چھبی اختق کا ڈرائیور کرم داد نیا ٹائر مانگتا ہے۔"

چراغ حسن حسرت اٹھ کر کمرے سے باہر آگئے اور اکاؤنٹنٹ کو آواز دے کر کہا۔

"مولانا اللہ کے بازار سے کچھ ٹائر منگوا کر یہاں رکھوا دیجیے۔ لوگ امروز میں ٹائر مانگنے بھی آجاتے ہیں۔"

امروز کا یہ دفتر ایک لمبا ہال کمرہ تھا جس میں تختے کھڑے کر کے پارٹیشن کر دی گئی تھی۔ حمید اختر ایک میز پر انڈیا کے اخبار پھیلاتے اس کے تراشے کاٹ رہا تھا۔ اونچا لمبا صحت مند نوجوان اور سر پر براؤن رنگ کے بالوں کا گھنا چھتہ۔ حمید اختر اب یہ جملہ پڑھے گا تو اُسے اپنے خوبصورت گھنے بال بہت یاد آئیں گے کیونکہ اب اس کے سر پرسے بالوں کا سایہ اٹھ چکا ہے۔ دبلا پتلا گورا چٹا خوبصورت عبداللہ ملک خبروں کا ترجمہ کر رہا تھا اور بار بار ماتھے پر آتے ریشمی بالوں کو پیچھے ہٹا رہا تھا۔ ایک جانب عبدالشکور احسن بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ حمید ہاشمی اور کرمانی ابھی نہیں آئے تھے۔ ہم کچھ دیر بیٹھے حمید اختر اور عبداللہ ملک سے باتیں کرتے رہے۔ حمید اختر نے چائے کی چینک منگوالی اور ہم چائے پینے لگے۔ امروز کے دفتر سے باہر نکلے تو میرا خیال تھا ابن انشاء فروٹ کیک والی بات بھول گیا ہوگا۔ میں سویرا کے دفتر کو جانے کے لیے گوالمنڈی کی جانب مڑنے لگا تو ابن انشاء نے کہا۔

"کوالٹی ریسٹورنٹ اُدھر نہیں اِدھر ہے۔"

ہم کوالٹی ریسٹورنٹ میں آکر بیٹھ گئے۔

شیشوں کے پیچھے سے میکلوڈ روڈ والے پیپل کے گھنے درخت نظر آرہے تھے۔ کسی وقت کوئی تانگہ گزر جاتا۔ بہت کم لوگ آجا رہے تھے۔ پیپل کے پتے بڑے ہرے بھرے تھے۔ کچھ شاخوں پر نسواری رنگ کی نئی نئی کونپلیں بھی پھوٹی تھیں۔ شاید بہار کا موسم تھا۔ یعنی چیت وساکھ کا مہینہ تھا۔ ان دنوں نہ گرمی لگتی تھی نہ سردی۔ ہر موسم پر بہار کے موسم کا گمان ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے یہ ان ہی دنوں کی بات ہے۔ میں کافی ہاؤس میں اکیلا بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ مضبوط تن و توش والا ہاکس نما صفدر میر اندر آیا اور میری طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔

"ارے تو یہاں بیٹھا ہے اور باہر اتنی خوبصورت لُو چل رہی ہے!"

ہاں۔ اُن دنوں مئی جون کی تپتی ہوئی دوپہریں، گرم لوئیں اور پوہ ماگھ کے مہینوں میں چلنے والی سرد برفیلی ہوائیں، یہ سب کچھ بڑا اچھا لگتا تھا۔ موسموں میں ہمارے بدن کی خوشبو تھی۔ گرم لوئیں ہمارے سانس کا ایک جھونکا تھیں۔ دسمبر کی سرد ہوائیں ہمارے جسموں سے چھو کر گرم ہو جاتی تھیں اور بہار کی ہوائیں ہمیں اپنے ساتھ ساتھ اڑائے لیے پھرتی تھیں۔ پیپل کے زرد اور سرخ پتوں کی طرح ہم موسموں کے ساتھ ساتھ جوان ہوتے تھے۔ ہر موسم کا طلوع ہوتا سورج ہم سے ہاتھ ملاتا تھا۔ آدھی رات کے ستارے ہمیں لاہور کی سنسان سڑکوں پر سرگشت کرتے دُور سے پہچان لیتے تھے اور ہم ستاروں کو دیکھ کر وقت بتا دیا کرتے تھے۔ گرم لوئیں ہمیں ٹھنڈا رکھتی تھیں۔ سرد ہوائیں ہمیں گرم کر دیتی تھیں۔ بہار کی ہوائیں ہمیں اعتدال بخشتی تھیں اور راتوں کی آوارہ گردی ہمیں دن کو نئے نئے خیال عطا کرتی تھی۔

لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ موسموں کا ہاتھ ہمارے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ خزاں، بہار اور رت جھڑ کا تیر ہماری کمان سے نکل گیا ہے۔ اب ہم صبح دیکھتے ہیں۔ سورج طلوع ہوتا نہیں دیکھتے۔ رات دیکھتے ہیں۔ ستارے نہیں دیکھتے۔

موسم ہمارے ایئر کنڈیشنڈ اور سنٹرلی ہیٹڈ کمروں کے دروازوں پر دستکیں دے کر گزر جاتے ہیں۔ گرمیوں میں ہم اپنی ایئر کنڈیشنڈ خواب گاہوں میں کمبل اوڑھ کر سوتے ہیں اور سردیوں میں ہم اپنے سنٹرلی ہیٹڈ کمروں میں بغیر لحاف کے سوتے ہیں۔ ہم نے موسموں کو دھوکا دیا ہے۔ ہم نے موسموں کا مذاق اڑایا ہے، لیکن موسموں کی بھی اپنی عزتِ نفس ہوتی ہے۔ ہم نے اُن کی عزت مجروح کی۔ انہوں نے ہم سے انتقام لیا۔ ہم نے انہیں چکمہ میں ڈالا، اُنہوں نے ہمیں بے راہرو کر دیا۔ موسم تو اپنی جگہ پر کھڑا رہا مگر ہم اپنے مدار سے ہٹ گئے۔

ابن انشاء میرے سامنے بیٹھا تھا۔ ابھی وہ اپنے مدار سے ہٹا نہیں تھا۔ ابھی موسموں کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ ابھی اُسے گرمی لگتی تھی۔ سردی محسوس ہوتی تھی۔ وہ پھولوں کی خوشبو محسوس کرتا تھا۔ اسے طوطوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں اور ہم دونوں کی زمین ایک ہی سورج کے گرد چکر لگا رہی تھی۔

ہمارا مدار ایک ہی تھا۔ چائے آ گئی۔ میں چائے بنانے لگا۔ میں نے ابن انشاء سے کہا فروٹ کیک کی جگہ کریم رول کیوں نہ منگوا لیں؟ کہنے لگا۔ نہیں۔ فروٹ کیک مہنگا ہوتا ہے۔ وہی منگواؤ۔ میں ابن انشاء کو چھیڑ رہا تھا۔ مجھے اُس سے پیار تھا اور اس کی دوستی مجھے بڑی عزیز تھی۔ اس کی صحبت میں بیٹھنے کے بہانے میں موقعے ڈھونڈا کرتا تھا۔ ان دنوں وہ بھی اتنا مصروف نہیں ہوا کرتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، ہم بہت کم ایک دوسرے سے الگ رہتے تھے۔ صبح نو بجے سے چکر شروع ہوتا۔ کبھی امروز کے دفتر میں تو کبھی سویرا کے دفتر میں اور کبھی ادبِ لطیف کے دفتر میں۔ یہاں سے فراغت ملتی تو لاہور کی گلیوں میں گشت لگانے نکل کھڑے ہوتے۔ شام کو پی ہاؤس یا کافی ہاؤس میں محفلیں لگتیں۔ سبھی دوست وہاں موجود ہوتے۔ کیسی کیسی پیاری صورتیں بیٹھا کرتی تھیں۔ کسی کونے میں انور جلال شمزا کے قہقہے گونج رہے ہیں، کہیں تنویر الحسنین کی لطیفہ بازیاں اور فقرے بازیاں ہو رہی ہیں۔ کہیں احمد بشیر بلند آواز میں باتیں کر رہا

ہے اور کہیں ناصر کاظمی اپنی تازہ غزل سنا رہا ہے۔ سیڑھیوں کے ساتھ والی میز پر قیوم نظر نے منڈلی جما رکھی ہے۔ لیجیے۔ ٹی ہاؤس کا دروازہ کھلا اور صفدر میر بھی اپنے پاؤں جھاڑتا، موٹی موٹی آنکھوں سے ماحول کا جائزہ لیتا اندر آ گیا۔ حمید اختر اور سبطِ حسن نے اُسے اشارے سے اپنی طرف بلا لیا ہے۔ اب فضا میں کبھی کبھی صفدر میر کا صحت مند طوفانی قہقہہ بھی گونج اُٹھتا ہے۔ اتنے میں م حسن لطیفی بھی اپنا لمبا کوٹ سنبھالتے اندر آ گئے ہیں۔ وہ بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئے ہیں۔ لطیفی صاحب یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ لدھیانہ کا اصل نام ارضِ لُدھ ہے اور اس کا ذکر بائبل میں ملتا ہے۔

ابن انشاء نے کہا۔

"پھلور کا ذکر توریت میں ملتا ہے۔ اس کا اصل نام "پھل اور" تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے جب اپنے آدمیوں کو وادیٔ سینا کے شمال کی طرف روانہ کیا تو واپس آ کر اُنہوں نے انگور کے گچھے اور سرخ سیبوں کی ٹوکریاں پیش کیں اور کہا کہ یہاں سے دو دن دو رات کی مسافت پر ایک بستی ہے جس کے باغ پھلوں سے لدے ہوئے ہیں پس حضرت موسیٰؑ کے ایک حواری نے اس کا نام 'پھل اور' رکھ دیا جو بگڑتے بگڑتے پھلور بن گیا۔"

"بھائی یوں تو ہر شہر کا نام کسی نہ کسی کتاب میں مل جائے گا۔"

انور جلال نے ساتھ والی میز سے آواز لگائی۔

"یار ذرا چوہڑ کانہ کا نام تلاش کرنا کہ کون سی کتاب میں ہے؟"

ابن انشا بولا۔

"یار تحقیق کا سارا کام مجھے ہی کیوں سونپ دیا۔ کچھ تم بھی تو ہمت کرو۔"

سب نے پیسے ڈال کر چائے منگوائی اور چائے کی گرمی میں محفل اور زیادہ گرم ہو گئی۔ بات ہیں کوالٹی ریسٹورنٹ کی کر رہا تھا۔

ابن انشاء اس وقت میرے سامنے بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ میں بھی چائے پی رہا تھا۔ ہم فروٹ کیک بھی کھا رہے تھے۔ ابن انشاء نے جیب سے ایک میٹھی گولی نکال کر مجھے دی اور ایک اپنے منہ میں ڈال لی۔ میں نے پوچھا۔

"یہ کیسی گولی ہے؟"

کہنے لگا۔

"برخوردار! پوچھا نہیں کرتے۔ یہ پیپر منٹ کی گولی ہے۔ تمہارا گلا سہگل کے موافق ہو جائے گا۔ کھا جاؤ۔"

ابن انشاء بھنے ہوئے چنوں، ریوڑیوں، پکوڑوں، کھٹی میٹھی گولیوں اور اس قسم کی نُقل کے طور پہ کام آنے والی چیزوں کا بڑا شوقین تھا۔ چلتے چلتے کسی ریڑھی والے کے پاس کھڑا ہو جاتا۔

"یار! تھوڑی سی گنڈیریاں لے لیں۔ چلتے بھی جائیں گے اور چوستے بھی جائیں گے۔"

پان اُسے کھانا بالکل نہیں آتا تھا۔ پان وغیرہ کا اسے شوق بھی نہیں تھا۔ بس کسی نے زیادہ اصرار کر کے کھلا دیا تو کھا لیا۔ ہاں جب ہم ڈھاکے گئے تو وہاں اُس نے دو ایک بار بڑے شوق سے پان کھایا تھا۔ کراچی میں آباد ہونے کے بعد بھی میرا خیال ہے، اُسے پان کھانے کی عادت نہیں پڑی تھی۔ وہ پان اس طرح کھاتا جیسے اُسے کوئی مصیبت پڑ گئی ہے۔ پان اس کے منہ سے باہر آنے کی کوشش کرتا اور وہ اُسے اندر نگلنے کی کوشش کیا کرتا۔ پیک تھوکتے وقت وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر آگے کو جھک جاتا اور بڑی احتیاط سے جھک کر بلکہ بیٹھ کر تھوکتا۔ میں اُسے کہا کرتا:

"یار تم گھٹے ہیں تو بڑا باندھا کرو۔"

وہ ہنس کر کہتا:

"ہم وضع دار لوگ ہیں۔ پان کھانے میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیتے ہیں۔"

پھر شریر آنکھیں جھپکا کر کہتا۔

"یار ویسے پان ایسی چیز خود کھانے سے بہتر ہے کہ کسی دوسرے کو کھِلا کر اُس کا تماشہ دیکھا جائے۔"

ایک دن ہم گوالمنڈی کے چوک میں سے گزر رہے تھے۔ ابن انشاء نے ایک جگہ گول گپے والے کو دیکھا تو وہاں رُک گیا۔

"گول گپے" کھاتے ہیں؟

ریڑھی والے نے ایک ایک پیالی ہمارے ہاتھوں میں تھما دی اور کھٹاس سے بھر بھر کر گول گپے مع چند ایک کالے اُبلے ہوئے چنوں کے ہماری پیالیوں میں رکھنے لگا۔ گول گپے کھاتے کھاتے ابن انشاء نے بڑے غور سے کھٹاس میں ڈوبے کالے چنوں کو دیکھا اور بولا۔

"یار! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ کالے چنے کس خوشی میں ساتھ دیتے ہیں؟ یہ تو ہم بھی مانتے ہیں کہ بکری مینگنیاں ڈال کر دودھ دیتی ہے لیکن یہ دکاندار کالے چنے ڈال کر گول گپے کیوں دیتا ہے؟"

میں پھر واپس کوالٹی ریسٹورنٹ میں چلتا ہوں۔

ابن انشاء میرے سامنے بیٹھا چائے پی رہا تھا اور گولی بھی چوس رہا تھا۔ سگریٹ وہ نہیں پیتا تھا لیکن کبھی کبھی — بہت شاذ و نادر — کسی دوست سے سگریٹ لے کر پی لیتا تھا۔ سگریٹ کو وہ یوں آگ دکھاتا جیسے ابھی بھک سے اڑ جائے گا۔ پھر جو وہ سگریٹ کا حشر کرتا میں اُسے بیان نہیں کر سکتا کیوں کہ مجھے سگریٹ سے بہت محبت ہے اور اس کا یہ حشر دیکھ نہیں سکتا تھا۔

اس روز کوالٹی ریسٹورنٹ میں مجھے سگریٹ لگاتے دیکھ کر اس نے خلافِ معمول مجھے سگریٹ پینے سے منع کرنے کی کوشش کی:

"اے حمید! سگریٹ کی بجائے جوس پیا کرو۔"

میں نے کہا: "جوس بھی پیتا ہوں۔"

کہنے لگا:

"وہ تو مجھے پتا ہے۔ تم امرتسری پہلوان کی اولاد ہو۔ دہی کا ادھرڑکا بھی پیتے ہو۔ جوس پیتے تو میں نے خود تمہیں دیکھا ہے۔ بلکہ میں نے تمہیں کئی بار جوس والے کی ریڑھی کے پاس مالٹوں کے چھلکے کھاتے بھی دیکھا ہے۔ کیونکہ بقول کرشن چندر مالٹوں کے چھلکوں میں وٹامن زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر تم اسی باقاعدگی سے ہر سیزن میں مالٹے کے چھلکے کھاتے رہے تو ایک نہ ایک دن ضرور دودھ دینے لگو گے۔"

ابن انشاء باتیں کرتا رہا۔ خود بھی ہنستا رہا۔ مجھے بھی ہنساتا رہا۔ پھر میرے افسانوں پر گفتگو شروع ہو گئی۔ میرا نیا افسانہ 'منزل منزل' ادبِ لطیف کے سالنامے میں چھپا تھا۔ ابن انشاء کان میں ماچس کی سلائی گھماتے ہوئے بولا:

"اس کہانی میں مجھے وہ منظر بڑا پسند آیا جہاں راجدہ ڈیوڑھی میں بیٹھ کر چھابڑی والے سے کھٹے سنگترے خریدتی ہے۔"

پھر پوچھنے لگا:

"یہ راجدہ لڑکی جو ہے ___ میرا مطلب ہے کہ یہ ریحانہ نہیں ہے ناں؟"

پھر خود ہی بولا۔

"لیکن ریحانہ تو بقول تمہارے کینرڈ کالج میں پڑھتی ہے۔ وہ راجدہ نہیں ہو سکتی۔ اچھا ایک بات ہے۔ کمینے یہ بھولی بھالی لڑکیاں تمہارے فریب میں بہت آجاتی ہیں۔"

میں نے کہا۔

"خدا کی قسم میں نے آج تک کسی لڑکی کو فریب نہیں دیا۔"

گردن ہلا کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"بکواس مت کرو کمینے۔"

"تمہارے لیے چائے اور بناؤں؟"

"نہیں فروٹ کیک منگواؤ۔"

ہاف سیٹ چائے اور فروٹ کیک بھی آگیا۔ میکلوڈ روڈ کے پیپل کے درختوں میں ہوا سرگوشیاں کر رہی تھی۔ ابن انشاء چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ میں نے 'منزل منزل' کی ہیروئن راجدہ کی کوئی بات کی تو بولا۔

"یار! راجدہ کا جو ناک نقشہ تم نے کھینچا ہے اسے دیکھ کر مجھے پھلور کی ایک لڑکی کا خیال آتا ہے۔"

بس اس سے آگے ابن انشاء نے کچھ نہ بتایا۔ اپنی رومانٹک زندگی کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے جب بھی کریدنا چاہا، وہ ٹال جاتا اور کوئی دوسری بات شروع کر دیتا ہے۔ بہت دنوں بعد جب وہ کراچی آچکا تھا تو اس نے مجھے ایک چھوٹی سی رومانٹک داستان سنائی۔ پھر اس نے مجھ سے مشورہ لیا۔ میں نے ایسا مشورہ دیا کہ تختہ ہی الٹ گیا۔ ابن انشاء مجھے گالیاں دیتا رہ گیا۔ ویسے اسے گالی دینا نہیں آتی تھی۔ مجھے صرف ایک گالی دیا کرتا۔ 'حرامزادے'۔ اور یہ گالی جب بھی میں اس کی زبان سے سنتا تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔ یوں لگتا جیسے وہ مجھے کوئی اعزاز دے رہا ہے۔

میں نے ابن انشاء سے کہا۔

"پرسوں ریحانہ کا کانووکیشن ہے۔ اسے بی اے کی ڈگری مل رہی ہے، میرے ساتھ تم بھی چلنا۔ بڑا مزہ رہے گا۔"

ابن انشاء اپنی ٹائی کی گرہ ٹھیک کرتے ہوئے بولا۔

"کمینے! تم تو اس کے بھائی بن کر چلے جاؤ گے میں کیا بن کر جاؤں گا۔"

اور میں نے ابن انشاء کو وہی گالی دی جو وہ مجھے دیا کرتا تھا۔

کانووکیشن کا وقت سہ پہر پانچ بجے تھا۔

میں نے ساڑھے تین بجے ابن انشاء کو ساتھ لے لیا۔ ہم ایبٹ روڈ سے نکل کر اسمبلی ہال سے ہوتے ہوتے لارنس باغ میں آ گئے۔ میرا خیال تھا کہ پہلے ہم کچھ دیر چڑیا گھر کی سیر کریں گے۔ پھر لارنس باغ کے اوپن ایئر کیفے میں بیٹھ کر چائے پئیں گے اور پونے پانچ بجے کے قریب کینیرڈ کالج کی طرف چل پڑیں گے۔ چڑیا گھر کی سیر کا پروگرام ابن انشاء نے یہ کہہ کر منسوخ کر دیا کہ اے حمید کے ساتھ ہوتے ہوئے چڑیا گھر کی سیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

"ہاں اوپن ایئر کیفے میں چائے ضرور پیوں گا بشرطیکہ تم پلاؤ۔"

اوپن ایئر کیفے لارنس باغ کی پہاڑی کے دامن میں تھا اور وہاں سوائے سبز رنگ کے ایک کیبن اور باہر لان میں بکھری دو چار کرسیوں کے اور کچھ بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔ ہم لان میں گھاس پر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ چائے آ گئی۔ باتیں شروع ہو گئیں۔ ابن انشاء نے مجھے ایک نظم سنائی۔ چھوٹی سی معصوم سی نظم تھی۔ اب مجھے یاد نہیں رہی، لیکن نظم سناتے ہوتے ابن انشاء کے چہرے پر جو بھولپن اور معصومیت جھلکنے لگی تھی، وہ آج بھی یاد ہے اور ساری زندگی یاد رہے گی۔ شاید وہ نظم چین کے بارے میں تھی اور اس نے چین کے قدیم رومانٹک شاعر لی پو کی ایک نظم سے

متاثر ہو کر لکھی تھی۔ بعد میں ابن انشاء نے اس عظیم رومانٹک چینی شاعر کی نظموں کا منظوم ترجمہ بھی کیا جو ایڈگر ایلن پو کی کہانیوں اور نظموں کے ترجمے کے ساتھ اس کا عظیم شاہکار ہے۔

"اچھا اب میں تمہیں ہان شان کی ایک چینی نظم کا ترجمہ سناتا ہوں۔
تاکہ تم مجھے اپنی ریجاڈ کی باتوں سے بور نہ کرو۔"

ابن انشاء ان دنوں مختلف چینی شاعروں کی نظموں کے ترجمے کر رہا تھا۔ یہ نظمیں ۱۹۶۱ء میں لاہور اکیڈمی کی طرف سے 'چینی نظمیں' کے نام سے شائع ہوئیں۔ اس کا دیباچہ مختار صدیقی نے لکھا تھا لیکن وہ بقول ابن انشاء ضائع ہو گیا۔ نظموں کی آرائش میرے چھوٹے بھائی مقصود نے کی تھی۔ چنانچہ اس کتاب کے شروع میں 'تقریب' کے عنوان سے ابن انشاء لکھتا ہے۔

"۱۹۴۹ء میں بھادوں کا مہینہ تھا کہ حالات کی آندھی مجھے لاہور سے اڑا کر کراچی لے آئی۔ نیا شہر، نئے لوگ۔ رین بسیرا — شہر سے دور ایک پرانے اسپتال کی خستہ و خراب بارک مقرر ہوئی۔ جو مریضوں کے کام کی نہ رہی تھی۔ عجیب آسیبی ماحول تھا۔ دودکشوں میں سے ہوا چیختی سیٹیاں بجاتی گزرتی۔ احاطہ نیم اور بکائن کے پیلے ادھ پیلے پتوں سے پٹا رہتا، رات کو گورا قبرستان کی طرف کتے نوحے الاپتے اور پاس کے فوجی کیمپ کا گھڑیال ساعت بہ ساعت پہرے دار کی موگری سے جھنجلا اٹھتا۔ تنہائی اور اداسی کا یہ حصار توڑنے کے لیے آخر ایک شب میں نے پرانے جزدانوں کی سیر شروع کی۔ انہی میں مجھے اوراق کا یہ شیرازہ یعنی چینی نظموں کے ترجمے کا مسودہ ملا جس کی ترتیب و تہذیب معروفیتوں کے کارن رکی ہوئی تھی۔ لخت لخت کو سمیٹنے، چھانٹنے، نظم کرنے میں مہینوں لگ گئے، لیکن بہرحال کام انجام کو پہنچ گیا۔ جاڑے گزرتے، چیت آنے تک اچھا خاصا دفتر تیار تھا۔

تھا تو یہ اپنے شوق کا کارخانہ لیکن متفرق نظمیں ادبی پرچوں میں چھپیں تو لوگ متوجہ ہوئے۔ ایک ناشر نے فرمائش کی کہ کتاب بنا دو۔ یہ تھوڑا کام نہیں تھا۔ لاہور جاکر دوبارہ متنوں سے ترجموں کا موازنہ کیا صفائی اور منجھائی کی طرف اور توجہ دی۔ چینی شاعری کا خاکہ مرتب کیا اور مصنفوں کے حالات جمع کیے مختار صدیقی میرے مہربان دوست نے دیباچہ تک لکھ دیا اور اس میں نکتہ رسی کا حق ادا کیا۔ ہونہار آرٹسٹ مقصود نے ہر نظم کی آرائش کے لیے دلآویز نقوش رقم کیے جن میں واقعی چینِ قدیم کی روح کھنچ آئی تھی۔ لیکن میرا کاتب، میرا نفیس مزاج طابع اور ناشر سبھی جلد بازی سے نفور تھے اور اس مقولے کے قائل کہ جو کام کل پر ڈالا جا سکتا ہے اُسے آج کیوں کیا جائے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۵۹ء آگیا، پر کتاب نہ آئی۔

اس دیر سے بڑا نقصان ہوا۔ بعضے مسودے کراچی اور لاہور کے بار بار سفر میں آوارہ گرد ہو گئے۔ اب جو میں ڈھونڈھتا ہوں تو کتاب کے پہلے اوراق تو ملتے ہیں لیکن نہ میرے پیش لفظ کا کہیں نشان ہے نہ مختار صدیقی کا دیباچہ دستیاب۔ مقصود کی تصویریں انہی ناشر کے پاس رہ گئیں جن سے گزشتہ سال میں نے کتاب کے حقوق واپس لے لیے۔ تلافی کے لیے قدیم شاعری پر ایک مختصر نوٹ لکھ دیا۔ جن کو زیادہ جستجو ہو انہیں انگریزی کتابوں خصوصاً آرتھر ویلی کے مقدموں میں بہت کچھ مل جائے گا۔ جدید نظموں کے متعلق اتنا کہنا ضروری ہے کہ یہ فقط اس صدی کی چوتھی دہائی تک کی ہیں۔ ان میں مغربی جدیدیت کا پرتو ہے لیکن چینی روح کے ساتھ۔

میری کوشش یہ رہی ہے کہ ترجمے اصل کے پابند رہیں، لیکن شاعری رنگ و بو، تاثیر اور رچاؤ سے عاری نہ ہونے پائے۔

ان میں آپ کو اظہار کے انوکھے پیرائے اور تکنیک کی کچھ بدعتیں بھی ملیں گی۔ خدا کرے اہلِ ذوق کے نزدیک پسندیدہ ٹھہریں۔ سرورق اور اندر چوپان کا نقش دونوں۔ مصوّر اور حُسن کار رائے کی عنایت ہے۔ اُدھر جاتا ہے یا دیکھیں ادھر پروانا آتا ہے۔

ابنِ انشاء
اگست ۱۹۶۰ء

یہ کتاب بڑے خوبصورت رنگین سرورق کے ساتھ چھپی۔ ابنِ انشاء نے مجھے جو کاپی دی اُس پر اپنے ہاتھ سے لکھا۔

"ریحانہ اور اے حمید کے لیے
ابنِ انشاء
۲۴ فروری ۱۹۶۱ء"

ابنِ انشاء کی طبع زاد نظموں اور غزلوں کی پہلی کتاب "چاند نگر" مکتبہ اردو نے ۱۹۵۵ء میں طبع کی۔ اس پر ابنِ انشاء نے یہ لکھ کر مجھے ایک کاپی دی۔

"ریحانہ اے حمید کے لیے
ابنِ انشاء
۴ر اکتوبر ۱۹۵۵ء"

میری بیوی کا نام اُس نے دونوں کتابوں پر ساتھ اس لیے لکھ دیا کہ اُسے ریحانہ کو الگ ایک کاپی نہ دینی پڑے، چنانچہ جب ایڈگر ایلن پو کی کہانیوں کا ترجمہ مرکز ادب کراچی والوں نے چھاپا اور ابنِ انشاء مجھے اس خوبصورت اور قیمتی کتاب کی ایک کاپی دینے لگا تو اس پر لکھا۔

"پیارے اے حمید کے لیے
دیتے ہوئے تکلیف تو ہوتی ہے لیکن مجبوری
ابنِ انشاء

"کراچی، ۱۸ ستمبر ۱۹۵۹ء"

یہ کتابیں میرے سامنے کھلی پڑی ہیں۔ ان پر ابن انشاء کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر ویسے کی ویسی ہے۔ کسی جگہ پر بھی سیاہی پھیکی نہیں پڑی، یوں لگتا ہے جیسے ابھی ابھی وہ ان کتابوں پر آٹوگراف لکھ کر اپنے ایبٹ روڈ والے مکان پر گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں واپس آ کر میرے پاس آرام کرسی پر بیٹھ جائے گا اور ناک پر انگلی سے عینک ٹھیک کرتے ہوئے کہے گا۔

"یار! یہ کتابیں تم مجھے واپس نہیں کر سکتے؟ ہاں آٹوگراف میں تمہیں کسی کاپی پر لکھ کر دے دوں گا — اس سے بھی اچھا آٹوگراف ہو گا۔"

جس کمرے میں بیٹھا میں اپنے پیارے ابن انشاء کی یادیں لکھ رہا ہوں، اس کی کھلی کھڑکی کے باہر سرو کا درخت ہے۔ اس درخت پر ابھی ابھی ایک سرخ چونچ والی بلبل آ کر بیٹھی تھی۔ وہ اڑ گئی ہے۔ ابن انشاء کی یادیں مجھے اپنے ساتھ اڑائے لیے پھر رہی ہیں اس لیے تسلسل بار بار ٹوٹ جاتا ہے، لیکن ان یادوں پر میرا اختیار نہیں ہے۔ تسلسل توڑنے کو جی نہیں چاہتا لیکن مجبوری!

میں کہہ رہا تھا کہ لارنس باغ کے اوپن ایئر کیفے میں چائے پیتے ہوئے ابن انشاء نے مجھے ہان شان کی ایک نظم سنانے کے لیے کہا۔ اس نے کوٹ کی جیب میں سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا۔ اُسے احتیاط سے کھولا۔ ناک پر عینک ٹھیک کی اور اپنے دھیمے میٹھے میٹھے گرم خوشگوار لہجے میں سنانے لگا۔

"اکثر کوئی آ کر پوچھتا ہے
کس اور یہ ٹھنڈا پربت ہے
کس راہ پہنچتے ہیں راہی

٭

اس پربت کی کوئی راہ نہیں

گرمی کے دنوں میں بھی اس کی
کبھی برف پگھلتی نہیں دیکھی
بس ابر کا سایہ رہتا ہے
یا کہرا چھایا رہتا ہے
تم پوچھو گے پھر میں کیسے
اس کوہ پہ آن بسا لوگو
مرا من ہے بھلا تم سا لوگو

٭

تم لوگ اگر مجھ سے ہوتے
میرے پاس یہاں رہتے ہوتے
میرے پاس۔ اس ٹھنڈے پربت پر"

بہار کا موسم تھا۔ لارنس باغ کے درختوں میں پھولوں کی خوشبوئیں اڑ رہی تھیں۔ اس زمانے میں خال خال لوگ باغوں میں جایا کرتے تھے۔ بڑا سکون تھا۔ پہاڑی پر ایک طوطا بول رہا تھا۔ سامنے مسجد کے پچھواڑے لوکاٹوں کے پیڑ تھے۔ اُن کے اوپر سے چڑیوں کا ایک جھنڈ اُڑ کر ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گیا۔ ابن انشاء نے آنکھیں اٹھا کر چڑیوں کے اڑتے جھنڈ کو دیکھا اور پوچھا۔

"کیسی نظم ہے؟"

میں اُسے کیا بتاتا کہ نظم کیسی تھی۔ میں تو ابن انشاء کو دیکھ رہا تھا جو خود اس نظم میں ڈھل گیا تھا۔ ایک دھیما دھیما درد سا تھا۔ رومانٹک کیتھارسز تھا جو اُس کی آنکھوں میں سلگ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی آنچ سی تھی جس نے اس کے رخساروں کو تمتما دیا تھا۔ مجھے بھگت کبیر کا دوہا یاد آ رہا تھا۔

لالی میرے لال کی جت اُت دیکھوں لال
لالی دیکھن میں گئی میں بھی ہو گئی لال

اُس وقت ابن انشاء مجھے چینی شاعر ہان شان لگ رہا تھا۔ جس نے چینی نظم کا اردو میں ترجمہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ نظم چینی زبان میں خود لکھی تھی۔ میراجی اور نادر کاکوروی کے ترجموں کی روایت تھی جسے میں ابن انشاء کے شعری ترجمے میں دیکھ رہا تھا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میں نے کوئی چینی نظم سُنی نہیں بلکہ وہ خود میرے دل پر اتری ہے۔ میں نے خود وہ نظم کہی ہے۔ ہلکے ہلکے درد کا یہ گھیراؤ اور نکھار سُر کا یہ سلگاؤ ابن انشاء کا شعری مزاج تھا۔ اس میدان میں وہ ہم عصر ترقی پسند شاعروں سے بالکل الگ تھا۔ کبھی کبھی اُس کی شاعری پر رجعت پسندی اور رومانویت کی انگلیاں بھی اٹھائی گئیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب کبھی وہ میرے ساتھ لاہور شہر کی پُراسرار گلیوں کی سیر و سیاحت کو نکلتا تو کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا کرتا تھا۔ اس خیال سے کہ اُس کے ہم عصر ترقی پسند دوست اُسے رجعت پسند یا رومانٹک نہ سمجھنے لگیں۔ کیونکہ پرانی گلیوں، قبرستانوں اور پرانی یادوں کا ذکر کرنا اُس زمانے کے ترقی پسند دانشوروں کے نزدیک انتہائی رجعت پسندی کی بات تھی۔

رومانٹک ہونے کے ساتھ ساتھ ابن انشاء زبردست سیاسی شعور کا مالک تھا۔ اُسے چلی سے لے کر چین تک کی تمام سیاسی اور ادبی تحریکوں کی پوری پوری خبر ہوتی تھی۔ اُسے پوری تفصیل کے ساتھ علم ہوتا تھا کہ کس ملک میں کون سی مزدور تحریک، کسان تحریک اور سیاسی تحریک زوروں پر ہے اور کہاں کہاں بیٹھا کون کون نئی تحریکوں کے بارے میں لکھ رہا ہے۔ ابن انشاء کی وجہ سے یہ جراثیم میرے اندر بھی پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے ان سے پیچھا چھڑایا، لیکن ابن انشاء انتہائی گہرا رومانٹک ہونے کے باوجود شدید قسم کا ترقی پسند بھی تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس ترقی پسندی کے جراثیم پھلور سے اپنے ساتھ لے کر چلا تھا جبکہ میں امرتسر سے سوائے کمپنی باغ کی خوشبوؤں کے

اور کچھ بھی ساتھ نہیں لایا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ابن انشاء نے اپنے گاؤں کے درختوں پر بولنے والے طوطوں کو یاد رکھا تھا، چنانچہ جب میں نے ابن انشاء کو کمپنی باغ کے درختوں سے ملوایا تو اس نے اپنے گاؤں کے طوطے لا کر اُن پر بٹھا دیئے اور یوں زندگی کے کمپنی باغ میں ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سیر کرنے لگے۔

ایک روز ہم دوسرے دوستوں کے ساتھ سویرا کے میکلوڈ روڈ والے دفتر میں بیٹھے تھے۔ عبدالمجید بھٹی اپنی کوئی تازہ نظم سنا رہے تھے جسے چوہدری نذیر بڑے غور سے سُن رہے تھے کیونکہ انہیں یہ نظم سویرا میں شائع کرنی تھی۔ جب کبھی ہمیں اندرون شہر کی سیر کے رجعت پسند سفر پر احباب کی محفل سے اٹھ کر جانا ہوتا تو ہم ایک دوسرے کو خاص اشارہ کیا کرتے تھے۔ ابن انشاء نے بائیں ہاتھ کی انگلی دائیں ابرو کے اوپر دو تین بار لگا کر مجھے اشارہ کیا کہ چلو دوست اندرون شہر گشت کو نکلیں۔ میں آوارہ گردی کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا اور خاص طور پر اس وقت تو بہت زیادہ تیار ہوتا جب ... کوئی شاعر نظم سنا رہا ہو اور چوہدری نذیر غور سے سن رہے ہوں۔

پہلے میں اٹھ کر نیچے آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ابن انشاء بھی سیڑھیاں اُترتا بازار میں آ گیا۔ وہ یوں خوشی سے لال ہو رہا تھا جیسے کسی بچے کو سکول سے اچانک چھٹی مل گئی ہو۔ ہم دیال سنگھ کالج کے آگے سے گزر کر گوالمنڈی کی گلیوں میں داخل ہو گئے۔ ابن انشاء نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ویسے اے حمید تمہیں بھٹی صاحب کی نظمیں غور سے سُننی چاہئیں....
...نظمیں نہیں سنو گے تو تمہارا سیاسی شعور بالغ کیسے ہوگا؟"

میں نے ابن انشاء کی پیٹھ پر زور سے مکا مارتے ہوئے کہا۔

"تمہارے سیاسی شعور کی ایسی کی تیسی......"

موچی دروازے میں داخل ہوتے ہی ابن انشاء نے اپنی جیب مونگ پھلی اور ریوڑیوں سے بھر لی۔

"تم بھی اپنی جیب بھر لو کمینے! میں تمہیں ایک بھی مونگ پھلی یا ریوڑی نہیں دوں گا۔"

لیکن سارا راستہ وہ مجھے اپنی جیب میں سے مونگ پھلی ریوڑیاں کھلاتا رہا۔ ہم شہر کے گنجان علاقے کی ایک نیم روشن چھتی ہوئی گلی میں سے گزر رہے تھے کہ ناگاہ ایک پرانی مسجد کا دروازہ نظر آیا۔

"یار یہ تو مجھے الف لیلی کے بغداد کی کوئی مسجد معلوم ہوتی ہے۔ اس کے اندر چلنا چاہیے۔"

ہم جوتے اتار کر مسجد میں داخل ہو گئے۔ یہ شاید سلاطین کے دور کی مسجد تھی۔ دیواروں پر رنگین پھولوں کے نقش ابھر رہے تھے۔ بیچ میں ایک حوض تھا جس کے سبز پانی میں مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ محرابوں میں نمدے اوپر کو لپٹے ہوئے تھے۔ بڑی پرانی اور ٹھنڈی ٹھنڈی پرسکون مسجد تھی۔ ابن انشاء بار بار پیچھے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ وہ مڑ کر کیا دیکھتا ہے۔ کہنے لگا۔

"الف لیلی کے بغداد کی مسجد ہے۔ ڈرتا ہوں کوئی بغدادی چور پیچھے سے آ کر ہمارے جوتے نہ لے اڑے۔"

ان پراسرار چھتی ہوئی گلیوں کی سیر کرتے کراتے ہم بازار سید مٹھا نکل آئے۔ یہاں سے پانی والا تالاب آ گئے اور پھر دائیں گھوم کر سنہری مسجد، ڈبی بازار کی سیر کرتے نور گلی میں سے گزر رہے تھے کہ ابن انشاء نے کہا۔

"تمہارے ساتھ ان پراسرار گلیوں کی سرگشت میں بہت مزا آتا ہے۔ دوسرے لوگوں کو ان باتوں سے دلچسپی ہی نہیں ہے۔ ارے گلیوں کی آوارگردی نہیں کریں گے تو لکھیں گے کیا خاک؟"

ایک تنگ گلی میں سے گزرتے ہوئے ہم نے ایک مکان دیکھا جس کی شہ نشین کی محراب پر کوئی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ ابن انشاء نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ

کر کہا۔

"دیکھو۔ یہ کوئی قرطبہ کی گلی لگتی ہے۔"

کسی روز ہم ریلوے سٹیشن کی طرف نکل جاتے اور پل پر کھڑے ہو کر ریل گاڑیاں دیکھتے۔ ابن انشاء مجھے بتایا کرتا۔

"ہمارا گھر ریلوے سٹیشن کے قریب ہی تھا۔ میں شام کو سیر کرتے کراتے ریلوے سٹیشن کے پل پر آ جاتا اور دیر تک ریل گاڑیوں کو آتے جاتے دیکھا کرتا۔ چھک چھک کرتا انجن سرخ رنگ کی ریل گاڑی کو لیے آتا۔ پل کے نیچے سے گزرتا۔ میں انجن کے دھوئیں سے بچنے کے لیے پرے ہٹ جاتا اور پھر گاڑی دور شام کے اندھیروں میں گم ہو جاتی۔ ریل کی سیٹی کی آواز آج بھی میرے دل میں پرانی یادوں کو بیدار کر دیتی ہے۔"

چاند کو دیکھ کر ابن انشاء کھو جاتا تھا۔ مجھے وہ رات آج بھی یاد ہے۔ شاید ہم پاک ٹی ہاؤس سے واپس ایبٹ روڈ کی طرف آ رہے تھے کہ میکلوڈ کے چوک میں پہنچ کر ہم نے گول گول پراسرار کچھ زرد کچھ سرخ چاند کو شملہ پہاڑی کی جانب سے طلوع ہوتے دیکھا۔ ابن انشاء ٹھٹھک سا گیا اور چاند کو دیکھنے لگا۔ چاند کسے پیارا نہیں لگتا؟ لیکن ابن انشاء پر چاند نے جادو سا کر رکھا تھا۔ وہ چاند کو یوں دیکھتا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہے اور جیسے چاند بھی دھرتی کے افق پر پہلی بار طلوع ہو رہا ہے۔ چاند کی کرنیں ابن انشاء کی زندگی کے ساتھ ساتھ سفر کرتی رہیں۔ چنانچہ اس نے پہلے شعری مجموعے کا نام بھی 'چاند نگر' رکھا۔

"اے حمید! میں نے چاند کو آبادیوں، ویرانوں اور کھیتوں میں بھی دیکھا ہے۔ ہر مقام پر اس کا روپ، اس کی چھب الگ ہوتی ہے۔"

ہمارے اس وقت کے ہم عصر ترقی پسند دانشوروں کے نزدیک چاند محض ایک پتھر کا گول ٹکڑا تھا جو زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے لیکن ابن انشاء کو اس

پتھر کے سینے میں کوئی ذی روح سانس لیتا محسوس ہوتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ چاند پر پریاں رہتی ہیں۔ سفید بالوں والی بوڑھیا چرخہ کاتتی ہے۔ خوابوں کی خیال انگیز وادیاں ہیں اور ہری بھری گھاس کے بڑے بڑے تختے پھیلے ہیں جن پر شام کو سفید پھولوں کی بارش ہوتی ہے اور پچھلے پہر آسمانی دیویاں عقیق و مرجان کے زیور پہنے سیر کو نکلتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اُسے یہ بھی یقین تھا کہ یہ خواجہ خضر یا الٰہ دین کے چراغ کا دور نہیں ہے۔ کوئی معجزہ وقوع پذیر نہیں ہو گا۔ تعویذ گنڈے بیماریوں کو دور نہیں کر سکتے۔ دعائیں کوئی اثر نہیں رکھتیں۔ (یہ میں آج سے ستائیس برس پہلے کے ابن انشاء کی بات کر رہا ہوں) اور ایشیا والوں کو کسی مہدیِ زماں یا دانائے راز کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ اندر سے خود ابن انشاء کو کسی مہدیِ زماں یا دانائے راز کا انتظار تھا۔ وہ خود کسی خواجہ خضر یا الٰہ دین کی تلاش میں تھا لیکن اس راز کو اُس نے اپنے سینے کی گہرائیوں میں دفن کر رکھا تھا۔ میں اس کی آئیڈیلزم دیکھتا تو اُس کی حقیقت پسندی 'یا ترقی پسندی' پر شک ہونے لگتا۔ اُس کی 'ترقی پسندی' دیکھتا تو اُس کی آئیڈیلزم پر فتوحات کا گمان ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ ابن انشاء کی آئیڈیلزم اور حقیقت پسندی کے درمیان چاند حائل ہو گیا تھا۔

ایک بار میں کراچی گیا اور ابن انشاء کے ہاں ٹھہرا۔ ان دنوں وہ جہانگیر روڈ پر رہتا تھا۔ ابن انشاء ڈرائنگ روم والے آہنی پلنگ پر لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ میں سامنے صوفے پر بیٹھا اُس سے گفتگو کر رہا تھا۔ اُسے چھیڑ رہا تھا۔ پھر میں اٹھ کر اُس کے پلنگ پر آ گیا اور اُسے تنگ کرنے لگا۔ ہم نے کشتی لڑنی شروع کر دی۔ میں نے اُسے بازوؤں میں دبا لیا۔ ابن انشاء مجھے بار بار اپنی وہی اکلوتی گالی دے رہا تھا۔

"اوئے حرام زادے، اوئے حرام زادے . . . . ."

اچانک میں نے کہا۔

"ابن انشاء تمہارے سر سے مٹی کے تیل کی بو کیوں آ رہی ہے؟ یہ تم نے بالوں میں کون سی ہیر کریم لگا رکھی ہے؟"

کہنے لگا۔

"کیونکہ ہم سب کا انجام مٹی اور پھر اس کا تیل ہے۔"

میں نے کہا۔

"نہیں یار! ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

ابن انشاء کھڑکی کے شیشوں سے باہر تکنے لگا۔ زبان سے اس نے جو فقرہ ادا کیا تھا اُسے اس کا دل نہیں مان رہا تھا۔ میں نے کچھ ایسا ہی محسوس کیا۔ یہاں سے اس کا چاند نگر کا سفر شروع ہوتا تھا۔ یہاں اُس کے اور اُس کی حقیقت پسندی کے درمیان چاند حائل ہو جاتا تھا اور وہ چاند کی وادی میں جواہرات کے ملبوسات والی پریاں اُترتے دیکھتا تھا' یا دیکھنا چاہتا تھا۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا، کوئی نہ کوئی بھید، کوئی نہ کوئی اسرار ضرور تھا جس کی چمک ایسے لمحات میں ابن انشاء کی آنکھوں میں اُبھر کر غائب ہو گئی۔ جیسے وہ اس سوچ میں ہو کہ اگر چاند محض ایک مادہ ہے تو پھر اس کی روشنی کیا ہے؟ اور اس روشنی میں اترنے والی شوخ چشم پریاں کیا ہیں؟

چونکہ یہ باتیں ابن انشاء کی شخصیت کا ایک حصّہ تھیں اس لیے انہیں جستہ جستہ بیان کر رہا ہوں بلکہ جتنا کچھ سمجھ سکا اتنا بیان کر رہا ہوں ورنہ مقصد ابن انشاء کے فنِ شعر پر بحث نہیں ہے۔

ہاں تو میں کانووکیشن کی شام کا ذکر کر رہا تھا۔

اوپن ایئر کیفے میں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ہم دونوں اٹھے اور کینیرڈ کالج کی طرف چل پڑے۔ کینیرڈ کالج میں بڑی رونق تھی۔ غروب ہوتے سورج کی لالی نے کالج کے اونچی چھتوں والے برآمدوں میں سرخ روشنی پھیلا رکھی تھی۔ [illegible] کر گھنے [illegible] طرح پھولوں کے چراغ روشن تھے اور چڑیوں کی

چہکار گونج رہی تھی۔ ہال کی جانب سے آرگن کے سر بلند ہو رہے تھے۔ کانووکیشن کی تقریب بڑی سادہ مگر پُروقار تھی۔ بعض لڑکیوں نے بالوں میں پھول سجا رکھے تھے۔ آرگن کی موسیقی، ڈوبتے سورج کی سرخی، گھنے درختوں کے سرخ پھول اور معصوم چمکیلے چہرے اور قسم قسم کی انگلش اور فرانسیسی خوشبوئیں — یہ سب کچھ ہمیں خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ واپسی پہ ہم لارنس باغ میں سے ہو کر گزرے۔ بہار کی رات کے سائے خوشبوئیں بن کر جھاڑیوں میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ہم اوپن ایئر کیفے میں چائے منگوا کر بیٹھ گئے۔ ابن انشاء خاموش تھا، پھر پیالی میں چمچ ہلاتے ہوئے بولا۔

"مجھے ایلن پو کی نظم 'گھنٹیاں' یاد آ رہی ہے۔ بڑی اسراری نظم ہے۔ میں اس کا ترجمہ کر رہا ہوں۔"

پھر وہ ایڈگر ایلن پو پہ باتیں کرنے لگا۔

"تم نے پو کی نظم 'یوریکا' نہیں پڑھی؟ اس نظم میں پو نے کائنات کی تخلیق اور نظریہ کائنات پر بات کی ہے۔ یہ سارا اسرار کیا ہے۔ ہم جس کائنات میں سانس لے رہے ہیں، یہ ہمیں ساتھ لے کر کونسی منزل کی طرف جا رہی ہے۔"

ابن انشاء ایڈگر ایلن پو کا زبردست مداح تھا۔ اس کی نظموں، اسراری کہانیوں اور مزاح نگاری کا والہ و شیدا تھا۔ اس نے پو کی کہانیوں کا ترجمہ بھی کیا جو مکتبہ فرینکلن کے اشتراک سے مرکز ادب کراچی کی جانب سے اندھا کنواں اور دیگر پُراسرار کہانیاں کے عنوان سے چھپا۔ اس کتاب کے دیباچے میں ابن انشاء نے لکھا۔

"ایڈگر ایلن پو اسرار کی کہانیوں میں اسٹیونسن کا مثیل ہے۔ سراغ رسانی کے ادب میں کانن ڈائل کا پیش رو، سائنسی رنگ کے افسانوں میں ایچ جی ویلز کا گرو اور تنقیدی مضامین میں اسٹیفن لیکاک کا استاد اور شاعری میں تو اسلوب اور خیال دونوں پہلوؤں سے اس کا درجہ اتنا اونچا ہے کہ ہم کسی دوسرے ایک شاعر کی نظیر پیش نہیں کر سکتے۔ میں نے پو کو ہمیشہ اپنے گورو دیو کی حیثیت دی ہے۔ مجھے اسکول کے زمانے میں بھی پو کی نظموں اور کہانیوں سے اتنا شغف تھا کہ دوستوں نے میرا نام ایڈگر ایلن پو رکھ دیا تھا۔"

رات گہری ہو گئی۔ لارنس باغ کے درختوں سے اوس کے موتی سبزے پہ گرنے لگے تھے۔ خنکی بھی ہو گئی تھی۔ رات کی شبنمی فضا میں باغ کے پُراسرار چھپے ہوئے پھولوں کی خوشبو گھل مل گئی تھی۔ ہر سانس کے ساتھ کسی گلاب، کسی چنبیلی، کسی مولسری کی مہک سینے میں جاتی تھی۔ اور ہر سانس موتیا اور رویل کے پھولوں کی خبر لاتا تھا۔ چائے کی تلخی، سگریٹ کا اروما اور سفید کلیوں کی خوشبو نے ہمیں اپنے ہالے میں لے لیا تھا۔

ہم لارنس باغ کی روشوں پر سے ہوتے ایبٹ روڈ پر آ گئے۔ میں نے ابن انشاء کو اس کے گھر چھوڑا اور خود کافی ہاؤس کی طرف نکل گیا۔

ساحر لدھیانوی بھی اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ لاہور آگیا۔

اُسے نشاط سینما کے سامنے اور ابن انشاء کے ساتھ والے لال مکان کا نچلا پورشن الاٹ ہوگیا۔ یہ پرانا خستہ حال مکان تھا۔ ساحر لدھیانوی کے کمرے کی دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ رہا تھا اور چھت کے کونوں میں جالے لٹک رہے تھے۔ اس کے غسل خانے میں بڑی سیلن تھی۔ ٹونٹی میں سے پانی مسلسل گرتا رہتا۔ ساحر غسل خانے کے طاق میں آئینہ رکھے شیو بنایا کرتا۔ ابن انشاء سے ساحر لدھیانوی اور حمید اختر کی پرانی یاری تھی۔ وہ بڑا خوش ہوا۔ اب ہم اکٹھے پاک ٹی ہاؤس جاتے اور محفل گرم کرتے۔ ساحر لدھیانوی کی کتاب 'تلخیاں' نئی نئی چھپی تھی۔ نیا ادارہ والوں کی طرف ساحر لدھیانوی کے اور مکتبہ اردو کی طرف کچھ میرے پیسے نکلتے تھے۔ ایک روز میں، ابن انشاء اور ساحر لدھیانوی ایبٹ روڈ سے سیدھا لوہاری دروازے آگئے۔

پندرہ بیس روپے ساحر لدھیانوی نے نیا ادارہ والوں سے لیے۔ دس پندرہ روپے میں نے مکتبہ اردو والوں سے لیے اور ہم انارکلی کے ممتاز ہوٹل میں جاکر بیٹھ گئے۔ یہاں اُن دنوں بڑے زور کی ریکارڈنگ ہوا کرتی تھی۔ اس شور میں بھی ہم بڑے سکون سے باتیں کیا کرتے۔ شور کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ اس ہوٹل میں ہم کیک پیسٹریاں اڑاتے۔ بڑی گرم جوشی سے باتیں کرتے۔ نہ ابن انشاء

کوئی غزل سناتا۔ نہ ساحر لدھیانوی کوئی نظم سناتا اور نہ میں اپنے کسی افسانے کی بات کرتا۔ بس لطیفے بازی ہوتی۔ ہنس ہنس کر ہماری آنکھوں میں پانی آجاتا۔ ابن انشاء کوئی ایسی بات کرتا کہ ہنسی سے دوہرے ہو جاتے۔ میں ابن انشاء سے لپٹ جاتا۔ کسی وقت اُسے اٹھا لیتا۔ وہ ایک ہاتھ سے عینک سنبھالے بار بار یہی کہتا۔

"اوئے چھڈ دے کمینے۔ اوئے میری عینک۔"

ممتاز ریسٹورنٹ کی باتیں یاد نہیں رہیں۔ ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ وہاں بات میں سے بات نکلتی تھی۔ آوازیں بہت پیچھے رہ گئی ہیں، لیکن ان کی بازگشت یادوں کے ایوانوں میں آج بھی گونج رہی ہے۔ شکلیں ویسی کی ویسی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ یہ ابن انشاء کوئی شرارت کر رہا ہے۔ وہ ساحر لدھیانوی چائے پی رہا ہے اور یہ حمید اختر ہوٹل کے دروازے میں داخل ہو رہا ہے اور ہماری طرف دیکھ کر دور ہی سے ہاتھ ہلا رہا ہے۔ گزری ہوئی ان محفلوں کے نقوش آج بھی شگفتہ ہیں جس طرح ابن انشاء کے ہاتھ کے لکھے ہوئے آٹوگراف کی تحریر تر و تازہ ہے۔ سامنے کا سارا ہال اُسی طرح سجا ہوا ہے۔ سادی کی ساری وادی اُسی طرح سرسبز و شاداب ہے۔ ہال اس ہال میں چلنے پھرنے والے، اس وادی کی ہری بھری روشوں پر سیر کرنے والے چہرے نظروں سے اوجھل ہو رہے ہیں۔

تونسہ شریف سے فکر تونسوی بھی لاہور آگیا۔

ہم نے دائل پارک کی ایک بلڈنگ کے نچلے پورشن پر قبضہ کر لیا۔ یہاں فکر تونسوی، میں، احمد راہی اور عارف عبدالمتین رہنے لگے۔ فکر تونسوی نے بعد میں ایک کتاب لکھی تھی 'چھٹا دریا'۔ اس کتاب میں اس بلڈنگ میں گزارے ہوئے دنوں کا اس نے بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس پورشن میں سوائے ایک صوفے اور ایک پلنگ کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ کارنس پر کانسی کا ایک پیالہ پڑا رہ گیا تھا۔ ابن انشاء اس پیالے کو دیکھ کر کہا کرتا۔

"یہ وہی پیالہ ہے جس میں سقراط نے زہر پیا تھا۔"

کسی روز ساحر لدھیانوی بھی یہیں رات بسر کرتا۔ فکر تونسوی، میں اور احمد راہی خالی پلنگ پر سوتے۔ عارف صوفے پر پڑ جاتا اور کسی روز ساحر پلنگ پر اور میں فرش پر سو جاتا۔ ایک رات سگریٹ ختم ہو گئے۔ پیسے بھی ختم ہو گئے۔ ہم کونوں کھدروں میں سگریٹوں کے ٹوٹے ڈھونڈھ کر پیتے رہے۔ سگریٹوں کے ٹکڑے بھی ختم ہو گئے۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہم باتیں کرتے کرتے سو گئے۔ رات کے پچھلے پہر میری آنکھ کھلی تو مجھے فضا میں سگریٹ کی بُو محسوس ہوئی۔ میں نے احمد راہی کو جگا کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"کوئی سگریٹ پی رہا ہے۔"

احمد راہی نے فکر تونسوی کو دیکھا۔ وہ گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔ اُس نے کہا۔

"سوائے ساحر لدھیانوی کے اور کوئی نہیں ہے۔"

ہم پلنگ سے کھسک کر صوفے کی طرف گئے۔ دیکھا کہ دیوار کی طرف منہ کر کے ساحر مٹھی میں سگریٹ دباتے ہوئے بڑے مختصر کش لگا رہا تھا۔ ہم نے ایک دم چھاپہ مار دیا۔ ساحر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یار ایک ٹوٹا میری جیب سے نکل آیا تھا، لو تم بھی کش لگا لو۔"

فکر تونسوی اور عارف بھی جاگ پڑے۔ ہم نے ساحر کو خوب زدوکوب کیا۔ رات کا باقی حصہ ہنسی ہنسی کی باتوں میں گزر گیا۔ کچھ دنوں بعد یہ ڈیرا بھی اُجڑ گیا۔ فکر تونسوی دلی چلا گیا۔ عارف کو پیسہ اخبار میں مکان الاٹ ہو گیا۔ احمد راہی گوالمنڈی کے ایک مکان میں آ گیا اور ساحر لدھیانوی اپنے اُسی نشاط سینما والے سرخ مکان میں اٹھ آیا۔

اب ہماری ملاقاتیں 'سویرا' کے دفتر میں ہوا کرتیں۔

'سویرا' کا دفتر ابھی میکلوڈ روڈ کے چوک میں گیتا بھون کے ایک کمرے میں تھا۔ یہ دفتر تقریباً سبھی ترقی پسند شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کی آماجگاہ

بن گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس پاس ہی دیال سنگھ کالج کی لائبریری میں ہوا کرتے تھے۔ بعد میں 'سویرا' کے دفتر میں بھی چند ایک اجلاس ہوئے۔ اسی دفتر کے نیچے ایک ریسٹورنٹ تھا۔ اس کا نام پیراڈائیز ریسٹورنٹ تھا۔ یہ ترقی پسندوں کا گڑھ تھا۔ م حسن لطیفی اسی ریسٹورنٹ کی گیلری میں امروز اخبار بچھا کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس ہوٹل کا مالک ادیبوں شاعروں کا بڑا احترام کرتا تھا۔ جو شاعر یا ادیب ادھار کھا کر مہینے کا بل ادا نہ کرتا یہ حضرت اس کا نام ہوٹل کے باہر لگے بلیک بورڈ پر جلی حروف میں لکھ دیا کرتے۔ ایک دفعہ ریسٹورنٹ کی گیلری میں ایک بڑے ٹُچ قسم کے شاعر اپنا طویل کلام سنا رہے تھے کہ بتی چلی گئی۔ انہوں نے کمال دانشمندی سے بیاض میز پر رکھی اور جیب سے ماچس نکال کر دیا سلائیاں جلا جلا کر اپنا کلام سنانا شروع کر دیا۔ ساری ماچس ختم ہو گئی۔ بیاض کی کچھ نظمیں ابھی باقی تھیں کہ بتی آ گئی۔

کیا دیکھتے ہیں کہ ساری گیلری خالی پڑی ہے اور وہ اکیلے بیٹھے ہیں۔

دوسرے دن میں نے ابن انشاء کو یہ واقعہ سنایا تو وہ اپنی موٹی موٹی آنکھیں گھما کر بولا۔

"اچھا، جب ہی میں بھی کہوں کہ یہ پیراڈائیز ریسٹورنٹ کے مالک کو کیا ہو گیا ہے کہ گریبان پھاڑے، بال بکھرائے سینہ کوبی کرتا شملہ پہاڑی کی طرف بھاگا جا رہا ہے۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اب پتہ چلا۔ بتی آنے کے بعد شاعر نے پیراڈائیز ریسٹورنٹ کے منتظم مالک کو پکڑ لیا اور یقیناً باقی بیاض اس پر ختم کر دی ہو گی۔ وگرنہ اُس شریف آدمی کا یہ حال کاہے کو ہوتا!"

اُسی زمانے کا ذکر ہے کہ ضلع بہاولپور میں انتخابات ہوئے۔ اس کی فہرستیں

چھاپنے کا کچھ کام چوہدری نذیر مالک "سویرا" نے بھی لے لیا۔ یہ فہرستیں کتابت ہونے کے بعد لیتھو پر چھپتی تھیں۔ چوہدری نذیر کو (خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) امیر اور احمد راہی کا بڑا خیال رہتا تھا۔ ایک روز ہم دونوں کو میکلوڈ روڈ والے "سویرا" کے دفتر میں سامنے بٹھا کر کہا۔

"آوارہ گردی ہی کرتے رہو گے یا کوئی کام بھی کرو گے۔ میرے پاس بلدیہ بہاولپور کی فہرستیں چھپنے کو آئی ہیں۔ اس کی کتابت خط نسخ میں ہوگی جو میرے خیال میں تم دونوں بڑی آسانی سے کر لو گے۔ ایک کاپی سولہ صفحے کی ہے اور فی کاپی کتابت شدہ دس روپے اُجرت ہوگی۔ کل سے میرے دفتر میں بیٹھ جاؤ اور کام شروع کر دو۔"

میں اور احمد راہی دونوں "سویرا" کے دفتر میں دری پر بیٹھ گئے اور زرد کاغذ پر شکستہ خط میں کتابت شروع کر دی۔ فہرستوں میں ووٹ دہندہ کا نام، ولدیت، پیشہ اور عمر درج تھی۔ مصیبت یہ آن پڑی کہ عمر اردو کے ہندسوں کی بجائے خدا جانے کون سی زبان میں لکھی تھی۔ کہیں ۱۱ لکھا تھا تو کہیں ۷ لکھا تھا۔ شروع شروع میں ہم نے بڑی دیانت داری سے کام لیا اور چودھری صاحب نے ان جناتی ہندسوں کی مع ترجمہ لسٹ بنا کر دے دی۔ مگر اس لسٹ کو پڑھنا بھی دردِ سر تھا، چنانچہ اب میں نے یہ کیا کہ عمر کے خانے میں جو جی میں آتا لکھ دیتا۔ اگر باپ کی عمر پندرہ برس لکھتا تو بیٹے کی عمر پچاس برس لکھ جاتا۔ ماں کی عمر گیارہ برس لکھتا تو بیٹے کی عمر ساٹھ برس لکھ دیتا۔ پہلے دن میں ایک کاپی بڑی مشکل سے لکھی گئی تھی۔ جب سے میں نے اپنے فارمولے پر عمل شروع کیا، دن میں دو بلکہ ڈھائی کاپی بھی لکھی جانے لگی۔

انچاس پچاس سن میں پندرہ روپے بیس روپے روز کی آمدنی بہت ہوا کرتی تھی۔ ایک روز ابن انشاء دفتر میں آیا تو ہمیں کاتبوں کی طرح دیوار سے ٹیک لگائے زانو پر تختی رکھے کتابت کرتے دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔

"اب تمہیں اصل کام ملا ہے۔"

جب اُسے معلوم ہوا کہ ہم روز پندرہ بیس روپے کما لیتے ہیں اور کتابت کے لیے خوش نویسی شرط نہیں ہے تو کہنے لگا۔

"لاؤ میں بھی ایک آدھ کاپی لکھ کر دیکھتا ہوں۔"

ابن انشاء کا خط بڑا اچھا تھا۔ اُس نے ایک صفحہ ہمارے پاس بیٹھ کر لکھا۔ چوہدری صاحب نے اُسے پسند کیا۔ پس ابن انشاء نے بھی کتابت شروع کر دی۔ وہ جناتی ہندسوں کی لسٹ کو بڑے غور غور سے پڑھ پڑھ کر کاپی میں لکھتا تھا۔ اور میں فر فر لکھے جا رہا تھا۔ میری طرف تعجب سے دیکھ کر بولا۔

"اوئے! تم ان ہندسوں کی تحریر کو کیسے پڑھ لیتے ہو؟ تمہیں کیسے اتنی جلدی پتا چل جاتا ہے کہ ۱۱ یا ۷ سے کیا ہندسہ بنتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"پیارے مشق کی بات ہے اور پھر میں امرتسر میں ایک ہندو منیم سے لنڈے سیکھا کرتا تھا۔"

ابن انشا بڑا متاثر ہوا۔ وہ دن میں بڑی مشکل سے آدھی کاپی لکھتا۔ آخر اُس پر میری عیاری کا بھید کھل گیا۔ میری گردن دبوچ کر بولا۔

"حرامزادے! تو باپ کی عمر اٹھارہ سال اور بیٹے کی عمر ساٹھ سال لکھ رہا ہے۔ یہ انتخاب ہوں گے کہ غدر مچے گا؟"

میں نے آنکھ مار کر کہا۔

"غدر مچے گا۔"

ابن انشاء نے غدر مچانے میں میرا ساتھ نہ دیا۔ وہ دو ایک کاپیاں کتابت کرنے کے بعد بھاگ گیا۔ بہرحال میں نے پوری محنت، فرض شناسی اور مکاری سے انیس بیس کاپیاں کتابت کر کے چودھری صاحب کے حوالے کر دیں۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ کسی وجہ سے انتخابات ہی ملتوی ہو گئے ورنہ بقول ابن انشاء بلدیہ بہاولپور

میں ایک بار تو عذر بچ جاتا۔ کیونکہ کتابت کے آخری مرحلے میں پہنچ کر میری طبیعت میں بڑی جولانی آگئی تھی اور میں نے مذکر کو مؤنث اور مؤنث کو مذکر باندھنا شروع کر دیا تھا۔ یعنی کریم بخش کو بنت شاداں بی بی اور رحمت خان کو ولد شریفاں بی بی لکھ دیا تھا۔

ابن انشاء کالم نویسی اور سادہ بامحاورہ اردو نویسی کے سلسلے میں چراغ حسن حسرت صاحب کو اپنا استاد مانتا تھا۔ ابن انشاء کو حسرت صاحب کے آگے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہہ کرتے میں نے نہیں دیکھا، لیکن اتنا ضرور دیکھا کہ وہ حسرت صاحب کا احترام استاد سمجھ کر کیا کرتا تھا۔ حسرت صاحب کا مزاحیہ کالم حرف و حکایات، ابن انشاء کا پسندیدہ کالم تھا۔ وہ مجھے پڑھ کر سنایا کرتا۔ خود بھی ہنستا اور مجھے بھی ہنسایا کرتا۔ ابن انشاء کے ہنسنے کا انداز بالکل بچوں ایسا لاابالی اور تصنع سے پاک تھا۔ ہنسی اس کے اندر سے پھلجھڑی بن کر چھوٹتی اور وہ ہنستے ہنستے سر کو پیچھے کر لیا کرتا۔ پھر سر آگے کر کے ہنستا اور گردن کو پیچھے جھکا لیتا۔ اُس کے قہقہے بڑے چھوٹے چھوٹے اور بے ساختہ ہوتے۔ زیادہ ہنسی آتی تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو جایا کرتا۔ کوئی بچہ بستہ کاندھے پر ڈالے سکول جا رہا ہوتا تو ابن انشاء اُس کی طرف دیکھ کر منہ بناتا اور پھر خود ہی ہنس پڑتا اور آنکھیں شرارت سے چمکنے لگتیں۔ کسی وقت امروز کے دفتر میں چراغ حسن حسرت کے کمرے میں بیٹھے ہوتے تو ابن انشاء بڑا سنجیدہ ہوتا۔ ہاں البتہ حسرت صاحب کی تیز باتوں پر وہ خوب ہنسا کرتا اور اپنی باتوں سے حسرت صاحب کو بھی ہنسایا کرتا۔ حسرت صاحب ابن انشاء سے بہت پیار کرتے تھے اور وہ اپنے اس ہونہار شاگرد کی خداداد ذہانت اور اسلوب نگارش سے بہت متاثر تھے۔ ابن انشاء 'امروز' میں مضامین بھی لکھا کرتا تھا۔ اور اس کے ترجمے بھی شائع ہوتے تھے۔ ترجمے میں ابن انشاء ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور مولانا ظفر علی خان کی روایت کو لے کر آگے بڑھا تھا۔ ان دنوں امروز میں جو مضامین چھپتے ان کا معاوضہ سات روپے فی کالم کے حساب سے ملتا تھا۔ اب

جو میں واقعہ آپ کو سنا رہا ہوں یہ میرے ساتھ ہوا ہے۔ بعد میں مختلف روایتوں کے ساتھ مشہور ہوا۔ میں اور ابن انشاء بیڈن روڈ پر سے گزر رہے تھے۔ رائل پارک سے بیڈن روڈ کی طرف جاتے ہوئے بائیں ہاتھ کو ایک جوتوں کی شاندار دکان آتی ہے۔ دکان کے شوکیس میں جوتے سجے ہوتے۔ نیچے قیمت کی چٹ لگی ہوتی تھی۔ ہم جوتے دیکھنے کھڑے ہو گئے۔ ایک بوٹ ابن انشاء کو پسند آگیا۔ چٹ پر بوٹ کی قیمت اکیس روپے لکھی تھی۔

ابن انشاء کہنے لگے۔

"یہ بوٹ امروز کے تین کالموں میں آئے گا۔"

لاہور میں پہلی دو منزلہ بس روٹ نمبر ایک پر چلی۔ یہ بس کرشن نگر کے سٹاپ سے چل کر مال روڈ پر سے گزر کر سیدھی لاہور چھاؤنی کو جاتی تھی۔ میں اور ابن انشاء اکثر اس بس کی سیر کیا کرتے۔ ہم کافی ہاؤس کے سٹاپ سے بس پکڑتے اور لاہور چھاؤنی جا کر اُترتے۔ بس میں رش بالکل نہیں ہوتا تھا۔ گرمیوں میں ٹھنڈی ہوا کھاتے۔ بس سٹاپ پر بس رکتی تو ہم درخت کی ٹہنیوں کو پکڑنے کی کوشش کرتے، کبھی اگلی سیٹوں پر جا کر بیٹھ جاتے۔ کبھی دائیں بائیں بیٹھ کر مال روڈ کے سبزہ زاروں کی سیر کرتے۔ بس لارنس باغ کے پہلو سے گزرتی تو دھوپ میں چمکتے سبزہ زار، گھنے سرسبز درخت اور پھولوں کے تختے دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ چھاؤنی کے سٹاپ پر اُتر کر ہم توپ خانہ بازار کو نکل جاتے۔ کسی چھوٹے سے چائے خانے کے باہر ٹوٹی پھوٹی کرسیوں پر بیٹھ کر چائے پیتے۔ گلی محلوں کی سیر کرتے اور پھر دو منزلہ بس پر بیٹھ کر مزے کرتے واپس آجاتے۔

ایک روز برسات کے موسم میں آسمان پر کالے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے، خوشگوار ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں مصری شاہ سے نکل کر ابن انشاء کے گھر کی طرف آ رہا تھا۔ رائل پارک کے قریب پہنچا تو ایک دم بارش شروع ہو گئی۔ ابن انشاء کے چینی بھگوڑے تک پہنچتے پہنچتے بارش میں بھیگ گیا۔ برآمدے میں

کھڑے ہو کر ابن انشاء کو آواز دی۔ سردار محمود باہر آیا۔

"ارے آپ تو بھیگ گئے۔"

اتنے میں ابن انشاء بھی باہر آ گیا۔ میں نے کہا۔

"یار چلو دو منزلہ بس کی سیر کرتے ہیں۔"

ابن انشاء نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولا۔

"معلوم ہوتا ہے تم دو منزلہ بس کی چھت پر بیٹھ کر آئے ہو۔ پہلے چائے پیتے ہیں۔ پھر چلیں گے۔"

برآمدے میں بیٹھ کر ہم نے چائے پی اور باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں بارش ختم ہو گئی اور ہم اسمبلی ہال کی جانب سے نکل کر چیرنگ کراس والے بس سٹاپ پر آ گئے۔ یہاں سے نمبر ایک دو منزلہ بس پکڑی اور اس میں بیٹھ کر چھاؤنی پہنچ گئے۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی اور برسات کی ٹھنڈی ہوا میں ہم نے سیر کا خوب لطف اٹھایا۔ توپ خانہ بازار میں چائے بھی پی۔ واپسی پر ہم پاک ٹی ہاؤس اتر پڑے۔ پاک ٹی ہاؤس میں ہمارے کئی ایک دوست محفل جمائے بیٹھے تھے۔ ہم بھی اس محفل میں شامل ہو گئے۔

ان ہی دنوں کیفی اعظمی بھی لاہور آ گیا۔ خوبصورت آنکھوں اور لمبے بالوں والا نوجوان —— پاک ٹی ہاؤس اور پیراڈائیز ریسٹورنٹ میں اس کے اشعار بھی گونجنے لگے لیکن وہ چند ہی روز لاہور میں قیام کرنے کے بعد بمبئی روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد ساحر لدھیانوی نے بھی بمبئی کے لیے پر تولنے شروع کر دیئے۔ ہم اُسے بہت سمجھایا کرتے کہ بمبئی جا کر کیا کرو گے۔ لاہور تمہارے لیے بڑا موزوں رہے گا۔ لیکن ساحر لدھیانوی کی قسمت اچھی تھی کہ اس نے ہماری نصیحتوں پر عمل نہ کیا اور بمبئی چلا گیا۔ ساحر لدھیانوی کے پاس گجریلے کے رنگ کا ایک اوورکوٹ ہوتا تھا۔ جسے میں، ساحر اور احمد راہی باری باری پہنا کرتے تھے۔ اتفاق سے میرے پاس ایک تصویر بچی رہ گئی ہے جس میں، میں، احمد راہی اور عارف عبدالمتین کھڑے ہیں۔

میں نے ساحر کا اوورکوٹ پہن رکھا ہے۔ اُس روز اوورکوٹ پہننے کی میری باری تھی۔

ایک بار ساحر کو اس کوٹ میں دیکھ کر ابن انشاء نے کہا تھا۔

"مجھے تو یہ گوگول کا اوورکوٹ معلوم ہوتا ہے۔ ضرور یہ ماسکو سے لنڈے بازار میں آیا ہو گا۔"

انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں ایک شاعر نے غزل پڑھی۔ اس کے ایک شعر کا مصرعہ یوں تھا۔

پھولوں پہ انہماک سے شبنم گرائیں گے

حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ پھولوں پہ انہماک سے شبنم گرانے کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ابن انشاء نے کہا۔

"بات بالکل صاف ہے۔ شاعر صاحب پھول پر جھکے ہوئے ہیں۔ ڈراپر ہاتھ میں لیے بڑے انہماک سے اس پر قطرہ قطرہ گرا رہے ہیں۔"

گوالمنڈی زندہ دلانِ امرتسر کا گڑھ ہے۔ ہجرت کے بعد ہمارے محلے کے تقریباً آدھے لوگ، دوست اور رشتے دار گوالمنڈی میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ چنانچہ میں اکثر ابن انشاء کو ساتھ لیے چوک گوالمنڈی میں اپنے دوستوں کے پاس آ جاتا۔ ہماری محفلیں، شیراز ہوٹل اور پنجاب مسلم ہوٹل اور کشمیری ہوٹل میں لگا کرتیں۔ ان محفلوں کی نوعیت پاک ٹی ہاؤس اور پیراڈائز ریسٹورنٹ کی محفلوں سے بالکل الگ تھی۔ صوفی ملتانی کے تنور کی پچھلی کوٹھڑی کی فضا سخت سردیوں میں خوب گرم ہوتی۔ اس کی ایک چھوٹی سی کھڑکی دوسری جانب ایک تنگ و تاریک گلی میں کھلتی تھی۔ جہاں چوری چھپے چرس وغیرہ بکا کرتی تھی۔ ادھر سے گھوڑوں کے اصطبل کی بُو آیا کرتی۔ اس کوٹھڑی میں بیٹھ کر کچھ لوگ چرس بھی پیا کرتے تھے۔ سردیوں میں جب کوٹھڑی کی فضا چرس کے دھوئیں سے بوجھل ہو جاتی تو کھڑکی کھول دی جاتی۔ چھت پر لگے زرد بلب کی روشنی میں مجھے کچھ لوگوں کی سرخ آنکھیں جگنوؤں کی طرح چمکتی نظر آیا کرتیں۔

صوفی نے بڑی سختی سے منع کر رکھا تھا کہ خبردار کوٹھڑی میں کوئی چرس نہ پئے لیکن نکا بھیلا کھڑکی کے باہر منہ نکال کر زور زور سے کش لگاتا اور پھر لوئی کی بکل مار کر چبوترے پر بیٹھ جاتا۔ یہی حال مستری نفرو کا تھا۔ وہ تالے مرمت کرتا تھا اور اس زمانے کی مشہور فلم ایکٹریس نمی کا عاشق زار تھا۔ کسی وقت ترنگ میں آکر صوفی کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہتا۔

"یار صوفی! کسی طرح تم مس نمی کو یہاں اپنے ہوٹل میں نہیں بلوا سکتے؟"

خواجہ احتشام فروش ہر وقت امرتسر کی باتیں کیا کرتے تھے۔ کسی وقت اچانک خاموش ہو جاتے جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے ہوں۔ پھر اچانک ٹھوڑی کو زور سے ہلا کر آنکھیں جھپکتے اور کہتے۔

"یار! امرتسر میں جگنو بڑے ہوا کرتے تھے۔"

جاوا رفوگر بڑی جوشیلی طبیعت والا تھا۔ اس کے ماتھے پر زخم کا لمبا نشان تھا۔ ایک روز اندر آکر ہاتھ گھما گھما کر خیالی تلوار چلانے لگا۔ حاجی ابو بکر نے پوچھا۔

"پہلوان کیا کر رہے ہو؟"

جاوا بولا۔

"حاجی صیب! بس یہی دل چاہتا ہے کہ اسی طرح گچھا گچھ تلوار چلاتا دشمن کے لشکر میں گھس جاؤں۔"

اسد گنجہ صوفی کے تنور پر قلچے لگاتا تھا۔ صبح کے وقت وہ مشین کی طرح پیڑوں پر تِل جما جما کر تنور میں لگائے جاتا اور شام کو تنور پہ بیٹھ کر سامنے شیراز ہوٹل کے باورچی سے فحش مذاق کیا کرتا۔

ایک روز صوفی نے اُسے کہا۔

"اسد! کبھی خدا کا نام بھی لے لیا کرو۔"

اسد گنجے نے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہا۔

"صوفی صاحب! امرتسر کی مسجد خیر دین میں ساری نمازیں پڑھتا تھا۔"

بلا دھوبی شراب کا رسیا تھا۔ شیراز ہوٹل میں آکر سب دوستوں سے صاف صاف کہہ دیا کرتا۔

"خبردار جو کسی نے مجھے ادھار دیا۔ خدا کی قسم سب کی شراب پی جاؤں گا اور ایک پائی واپس نہیں کروں گا۔"

حکیم سوختہ شاعر تھے اور عبد الرحمان امرتسری کی دکان سے چھ آدمیوں کا ہریسہ اکیلے کھا جاتے تھے۔ وہ کھا کر اٹھتے تو ایک قلچہ ہاتھ میں ہوتا جسے وہ توڑ توڑ کر کھاتے ہوئے اپنی دوکان پر آکر بیٹھ جاتے۔ وہ بلے کو شراب نوشی سے اکثر منع کرتے۔ ایک دن بلا بول اٹھا۔

"حکیم صاحب! میں نے کبھی تمہیں منع کیا ہے کہ تم ہریسہ کیوں کھاتے ہو؟"

ابن انشاء ان لوگوں سے مل کر بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"مجھے گورکی کے کردار یاد آگئے ہیں۔"

ایک روز میں اور ابن انشاء شیراز ہوٹل کے باہر کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ موسم گرمیوں کا تھا۔ کچھ دیر بعد سامنے مکانوں کی چھتوں کے اوپر سے گول گول زرد چاند طلوع ہوا۔ ابن انشاء چاند کو دیکھ کر رومانٹک ہو گیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ سامنے والے مکان کی چھت پر گاما قصائی مالش کروا رہا تھا۔ ابن انشاء اور میں ابھرتے چاند کو دیکھ رہے تھے کہ اتنے میں گاما مالش کروا کر اٹھا۔ اُس نے چاند کی طرف منہ کر کے دھوتی کھول کر خوب اچھی طرح سے جھاڑ کر پھر باندھی اور نیچے حکیم کو آواز دی۔

"حکیم صاحب سردائی اوپر بھیج دو۔"

ابن انشاء کا سارا رومانٹک کتھارسز تباہ ہو گیا ہنستے ہوئے بولا۔

"تم نے جو دیکھا ہے اُسے چھوڑو مگر چاند نے بھی زندگی میں ایسا منظر کبھی نہ دیکھا ہوگا۔"

شیراز ہوٹل میں کبھی کبھی امرتسر کے کچھ پنجابی شاعر اپنا تازہ کلام سنایا کرتے۔

الله دتا پنجابی کا بڑا اچھا شاعر تھا اور محبت تخلص کرتا تھا۔ وہ کوراان پڑھ تھا۔ اس کا گھر وہیں احاطے میں تھا۔ دوسری منزل کے ایک کمرے میں اکیلا رہتا تھا۔ ایک روز میں اور ابن انشاء اُسے ملنے گئے تو دیکھا کہ اوپر کھڑکی میں بیٹھا بیلے کپڑوں پر سیاہ نشان لگا رہا ہے۔ میں نے کہا۔

"استاد محبت مکان کی سیڑھیاں کدھر ہیں؟"

اوپر سے ہنس کر بولا۔

"اس مکان کی سیڑھیاں نہیں ہیں"

واقعی اس مکان کی سیڑھیاں نہیں تھیں۔ محبت نے دو رسوں میں بانس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے باندھ کر ایک کمند ٹائپ کی سیڑھی بنا رکھی تھی۔ اُسے نیچے لٹکا کر اترتا تھا۔ اس کے بعد اس کا بچہ سیڑھی اوپر کھینچ لیتا تھا۔ ابن انشاء بڑا ہنسا۔ کہنے لگا۔

"استاد جی آپ پنجابی فلموں کے ٹارزن ہیں"

ہمارا دوست نذیر بڑا اچھا گاتا تھا۔ بڑے سُر میں تھا اور آواز میں غضب کا سوز تھا۔ اُسے جگر کا کلام پورے کا پورا یاد تھا۔ جگر مراد آبادی کا عاشق تھا۔ پنجاب مسلم ہوٹل میں رات کو کسی وقت سبز چائے کا دور چلتا تو نذیر جگر کی یہ غزل بڑے دلنشیں انداز میں سنایا کرتا۔

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

ابن انشاء نے ایک بار اُسے کچھ شعر لکھ کر دیئے جو اُس نے بڑے پُرسوز انداز میں گائے۔ اب وہ شعر مجھے یاد نہیں رہے۔ ضرور وہ ابن انشاء کے اپنے شعر ہوں گے، کیونکہ ابن انشاء کو دوسرے شاعروں کے اشعار بہت کم یاد ہوتے تھے۔ اگرچہ گوالمنڈی میں ابن انشاء بہت کم آیا مگر اس زمانے کی یادیں ——— مختصر مگر خوشگوار یادیں آج بھی میرے دل میں محفوظ ہیں۔

داتا صاحب کے عرس کے موقع پر بھاٹی کے باہر تھیٹروں اور سرکس کمپنیوں کی بڑی رونق ہوا کرتی تھی۔ اگرچہ یہ رونق آج بھی اُسی طرح قائم ہے لیکن وہ دوست بچھڑ گئے جن کے ساتھ میں یہ رونقیں دیکھنے جایا کرتا تھا۔ ابن انشاء کو اس قسم کے تھیٹر دیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ ہم دونوں بھاٹی گیٹ کی طرف نکل آتے اور ایک ایک آنے کا ٹکٹ لے کر کسی نہ کسی تھیٹر میں داخل ہو جاتے۔ زمین پر دریاں بچھی ہیں۔ سٹیج پر پھٹا ہوا پرانا دقیانوسی سینری والا پردہ گرا ہوا ہے۔ بانس کے ساتھ دائیں بائیں گیس جل رہے ہیں۔ نیچے تخت پر ہارمونیم اور طبلے والا بیٹھا ہے۔ لوگ شور مچا رہے ہیں، سیٹیاں بجا رہے ہیں۔ کھیل لیلیٰ مجنوں کا ہے۔ ہم بھی دری پر جا کر بیٹھ گئے ہیں۔ اس زمانے میں لڑکے ہی لڑکیوں کا پارٹ ادا کیا کرتے تھے۔ اتنے میں ایک آدمی سٹیج پر آکر دونوں ہاتھ اٹھا کر کہتا ہے۔

"خاموش سائبان (صاحبان) خاموش! ڈرامہ شروع ہونے والا ہے۔ اپنی اپنی جیبوں سے ہوشیار رہیں"

اتنے میں پردہ اٹھا، لیکن پھر گر گیا۔ شاید رسّی ٹوٹ گئی تھی۔ لوگوں نے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ پردہ دوبارہ اٹھا اور سہیلیاں یعنی لڑکے عورتوں کے لباس میں منہ پر سرخی پاؤڈر تھوپے وگیں لگائے کورس گانے لگے۔ پھر لیلیٰ مجنوں کا کھیل شروع ہو گیا۔

ایک ایک مکالمے پر میں اور ابن انشاء ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ ابن انشاء ساتھ ساتھ فقرے چست کر رہا تھا۔ جو لڑکا لیلیٰ کا پارٹ ادا کر رہا تھا، اتفاق سے اس روز اس نے تازہ تازہ سر منڈوا دیا تھا اور وگ لگا رکھی تھی۔ منظر یہ تھا کہ لیلیٰ ذرا اوپر بالکونی میں کھڑی نیچے کھڑے مجنوں سے محبت کے مکالمے بول رہی ہے۔ پھر اُس نے جوشِ محبت سے جو نیچے مجنوں کی باہنوں میں چھلانگ لگائی تو اس کی وگ اوپر کسی کیل سے اٹک کر وہیں رہ گئی۔ مجنوں کی باہنوں میں

جو لیلیٰ گری یا گرا اس کی ٹنڈ چمک رہی تھی۔ مجنوں نے حاضرین کی طرف دیکھ کر موقع پر مکالمہ بولا۔

"یا اللہ! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ یہ لیلیٰ ہے کہ حلوہ کدو؟"

ایکدم پردہ گرا دیا گیا اور لیلیٰ دوبارہ وِگ فِٹ کروا کر سامنے آگئی اور جھک جھک کر لوگوں کو سلام کرنے لگی۔ پھر کمر پر ہاتھ رکھ کر ٹھمک ٹھمک گانے لگی۔

؎ کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو

کھیل کے اختتام پر ایسا ہوا کہ اچانک سٹیج کے دونوں گیس جلتے جلتے بھڑکے اور بجھ گئے۔ اس زمانے میں اکثر لوگ ٹارچیں ساتھ لے کر تھیٹروں اور سینما گھروں میں جایا کرتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جو حاضرین نے ٹارچ کی روشنی پھینکی تو کیا دیکھتے ہیں کہ سٹیج پر لیلیٰ اور مجنوں نے ایک ایک گیس کا ہنڈا پاؤں میں دبوچ رکھا ہے اور دھڑا دھڑ اس میں ہوا بھر رہے ہیں۔

عرس کے تیسرے روز میں اور ابن انشاء ٹکسالی دروازے کی جانب بھی شاہ تھیٹر میں گئے۔ وہاں سوہنی مہینوال کھیل ہو رہا تھا۔ مہینوال کوئی ہٹا کٹا پہلوان بنا ہوا تھا جس نے کلائی میں گھڑی باندھ رکھی تھی۔ مہینوال بڑے جذباتی انداز میں اپنی محبوبہ سوہنی سے ڈائیلاگ بول رہا تھا کہ کبابوں والے کے لونڈے نے سٹیج کے آگے سے گزرتے ہوئے مہینوال کی طرف دیکھ کر کہا۔

"پہلوان جی! شو ختم ہونے کے بعد کتنے کباب لاؤں؟"

مہینوال نے مکالمے چھوڑ کر لونڈے کی طرف منہ کر کے غصے میں کہا۔

"بک بک بند کر اوئے کھوتے دیا پُترا۔"

ابن انشاء بہت ہنسا۔ کہنے لگا۔

"بڑی اچھی بات ہے کہ یہ لوگ ڈرامہ بھی بولے جاتے ہیں اور آپس میں باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔"

ایک بار بھاٹی گیٹ والے کسی تھیٹر میں شیریں فرہاد کھیل ہو رہا تھا۔ اس

قسم کے تھیٹروں میں جب پردہ اوپر سے گرا کرتا تھا وہ لکڑی کی ایک وزنی گیلی سے بندھا ہوتا تھا۔ اسے کھینچنے پر وہ اوپر سے کھلتا ہوا دھڑام سے سٹیج پر آکر گر پڑتا تھا۔ یعنی کھل جاتا تھا۔ کھیل شیریں فرہاد کا آخری سین یہ تھا کہ شیریں کی موت کی خبر سن کر فرہاد سر پر کلہاڑا مار کر گرتا ہے اور مر جاتا ہے۔ دن میں دو تین شو اس کھیل کے ہوتے تھے۔ ہر بار فرہاد مر کر سٹیج پر گرتا تھا۔ اور تالیوں کی گونج میں پردہ اوپر سے ایکدم گر پڑتا تھا۔ فرہاد نے سٹیج پر ایک خاص جگہ مقرر کر رکھی تھی جہاں اُسے گرنا ہوتا تھا تاکہ اوپر سے آنیوالی وزنی گیلی سے وہ محفوظ رہے۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ حساب غلط ہو گیا۔ فرہاد کلہاڑا مار کر سٹیج پر گر پڑا۔ لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں۔ فرہاد کی خوش قسمتی تھی کہ عین وقت پر اُس نے جو ایک آنکھ کھول کر اوپر دیکھا تو اس کی جان ہوا ہو گئی۔ کیونکہ وہ اوپر سے گرنے والی وزنی گیلی کی زد میں تھا۔

اب لوگوں نے دیکھا کہ سٹیج پر پڑی ہوئی فرہاد کی لاش ایکدم سے بجلی کی مانند اٹھی اور ذرا پرے جا کر پھر دھڑام سے گر پڑی اور بے حس و حرکت ہو گئی۔ لوگ دم بخود ہی تھے کہ پردہ گر پڑا۔

داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کا عرس اب بھی آتا ہے۔ بھاٹی گیٹ کے باہر میلہ بھی لگتا ہے۔ مگر جس من موہنی صورت کے ساتھ میں اس میلے کی سیر کیا کرتا تھا وہ کہیں نظر نہیں آتی۔ وہ تو اس میلے میں کہیں بچھڑ گئی تھی اور بچھڑی بھی ایسی کہ پھر کبھی ملاقات نہ ہو گی۔

[illegible]

ابن انشاء زبانی اپنے شعر بہت کم سناتا تھا۔ اکثر اپنی کتاب یا کاپی کھول کر شعر سنایا کرتا۔ ایک روز مجھے یاد ہے بڑی بارش ہو رہی تھی۔ میں اُس کے چینی پیگوڈے یعنی ایبٹ روڈ والے مکان کے برآمدے میں اس کے پاس بیٹھا تھا۔ برسات کا موسم تھا۔ بڑی عمدہ چائے ہم پی رہے تھے اور ایبٹ روڈ پر سے بھیگتے لوگوں اور تانگوں کو گزرتا دیکھ رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ شاید یہ ۱۹۴۹ء کی برسات تھی۔ ابن انشاء نے اچانک اٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھہرو۔ میں تمہیں کچھ بیت سناتا ہوں۔ تازہ لکھے ہیں۔"

پھر وہ اندر گیا اور ایک کاپی اٹھا لایا۔ کچھ دیر اُس کی ورق گردانی کرنے کے بعد ایک کاغذ نکالا۔ کاپی بند کر کے تپائی پر رکھی اور بولا۔

"اگرچہ تمہارا شعر کا خانہ خالی ہے، پھر بھی ذرا غور سے سُننا۔"

اس نے تین بیت سنائے جو بعد میں اس کے شعری مجموعے "چاند نگر" میں بھی چھپے۔ یہ تینوں بیت مجھے آج بھی یاد ہیں۔

جی بہلتا ہی نہیں ہے کوئی ساعت کوئی پل
رات ڈھلتی ہی نہیں چار پہر سے پہلے!

ہم کسی در پہ نہ ٹھہرے، نہ کہیں دستک دی
سینکڑوں در تھے مری جاں ترے در سے پہلے

⁘ ⁘ ⁘

چاند سے آنکھ ملی، جی کا اُجالا جاگا
ہم کو سو بار ہوئی صبح، سحر سے پہلے

میں نے بیت سُن کر کہا۔

"چونکہ میرا شعر کا خانہ خالی ہے اس لیے میں تمہیں داد نہیں دے سکتا، لیکن یہ جس کے بھی شعر ہیں، بہت اچھے ہیں۔"

ان دنوں مال پر چیرنگ کراس کے پاس "لورینگز" نام کا ایک ریستوران ہوا کرتا تھا۔ ویسی خوبصورت خوشبودار چائے اور پُرسکون صاف ستھرا ماحول پھر کسی ریستوران کو نہ ملا۔ یہاں مشہور صحافی حمید نظامی بھی اپنے احباب کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ تانبے کی گول میزیں، سرخ کاشانی قالین اور تانبے ہی کے ایش ٹرے ــــ کونے میں بلبے گلدانوں میں سجی یوکلپٹس کی شاخیں، چھت سے فرش تک مخمل کے پردے اور اعلیٰ ترین چائے کی ہلکی ہلکی خوشبو ــــ دُور دُور بیٹھے ہوئے چند ایک کم سخن سکون پسند لوگ ــــ بڑا افسانوی ماحول تھا اُس ریستوران کا۔ ابن انشاء کو بھی 'لورینگز' کی پرسکون روحانی فضا بہت پسند تھی۔ کبھی کبھی ہم یہاں بھی چائے پینے آیا کرتے تھے۔ 'لورینگز' کی فضا میں اگر ابن انشاء بھی بہت رومانٹک ہو جایا کرتا تھا۔ کونے میں سجے بلبے گلدانوں اور دیواروں سے لگے کانسی کے منقش تھالوں کو دیکھ کر وہ بے اختیار کہہ اٹھتا۔

"یہاں بیٹھ کر ایک بار پھر طلسم ہوشربا لکھی جا سکتی ہے۔"

شاید اس فضا کا اثر تھا کہ اُس نے پہلی بار اپنی طویل کلاسیکی نظم 'بغداد کی ایک رات' مجھے اسی ریستوران میں سنائی۔ وہ دن اپنی تمام تر خوشبوؤں، رنگوں اور خوابناک فضاؤں کے ساتھ مجھے آج بھی یاد ہے۔ شاید جنوری کا شروع یا دسمبر کا آخر تھا۔

لاہور کا آسمان ابر آلود تھا اور مال پر ہلکی ہلکی دُھند چھائی ہوئی تھی۔ ہم "لورینگز" کی نیم گرم پُرسکون فضا میں بیٹھے خوشبودار چائے پی رہے تھے اور خدا جانے کس موضوع پہ باتیں کر رہے تھے۔ ابنِ انشاء نے ٹوئیڈ کا چیک کوٹ پہن رکھا تھا۔ گرے پتلون تھی اور گلے میں مفلر بھی تھا۔ باوقار چہرے پر سنجیدگی تھی۔ اُس نے جیب سے کاغذ نکال کر میز پر رکھے اور اپنی عینک صاف کرتے ہوئے بولا۔

"میری نظم سنو 'بغداد کی ایک رات'"

"ضرور سناؤ۔"

ابنِ انشاء بہت کم کسی کو شعر سنایا کرتا تھا۔ مجھے وہ یہ نظم شاید اس لیے سنانا چاہتا تھا کہ میں بھی بغداد کی راتوں کا مسافر تھا۔ عینک چڑھا کر وہ کچھ دیر کاغذوں کو الٹ پلٹ کر ٹھیک کرتا رہا۔

"تمہیں میری اس نظم میں طلسم ہوش ربا بھی ملے گا۔ شہرزاد کی راتیں بھی ملیں گی اور دجلہ کے کنارے مشقت کرتے ماہی گیروں کے گیت بھی سنائی دیں گے۔"

'بغداد کی ایک رات' ایک ایسی طویل نظم ہے جو ابنِ انشاء کو بہت پسند تھی۔ اس نظم میں ابنِ انشاء کی رومان پسندی، اسراریت اور حقیقت بینی اپنے پورے عروج پہ دکھائی دیتی ہے۔ مجھے یہ نظم ان دنوں بھی اپنی طلسمی فضا کی وجہ سے پسند تھی اور آج بھی اسی وجہ سے پسند ہے۔ میں نے مزید چائے منگوائی۔ ایک پیالی اپنے لیے اور ایک ابنِ انشاء کے لیے بنائی۔ ابنِ انشاء نے چائے کے دو ایک گھونٹ پیے۔ میں نے کریون اے کا سگریٹ سُلگا لیا۔

"اب شروع کرو۔"

اور ابنِ انشاء نے بڑی پُرسکون دھیمی آواز میں نظم سنانی شروع کر دی۔

سندباد آج تو ہوا وہ مجھے بھی لے چل
دل جو بہلا تو افسانوں ہی میں اپنا بہلا

میں ترے ساتھ زمانے کی نظر سے اوجھل
لے کے چلتا ہوں خیالوں کا سفینہ اپنا
جا ہی نکلیں گے کسی شہر میں ہم آج نکل

٭

شور و غل شہر کا مدھم ہوا، پھر ڈوب گیا
آج بستی سے بہت دُور نکل آیا ہوں
ظلمتِ شام نے دھندلا دیئے دشت و دریا
سوچتا ہوں کہ سرائے کو ابھی لوٹ چلوں
یا اسی ساعتِ ویراں کے کسی گوشے میں
سرد بازو کو بنائے ہوئے بستر اپنا
آج کی رات گزاروں کہیں بیٹھے بیٹھے
شہر و صحرا میں مسافر کے لیے فرق ہی کیا؟

٭

خواب آلودہ ہے دجلہ کے سواحل کا جہاں
پھیلے جاتے ہیں پُراسرار دُھندلکے ہر سُو
خُنکیاں وسعتِ صحرا میں ہوئیں بال فشاں
سوندھی سوندھی سی یہ آتی ہے کہاں سے خوشبو
سطحِ دجلہ پہ گُذر کوئی محیلہ کوئی
شام کی دھند میں لپٹا ہوا ہولے ہولے
شہر کی سمت بڑھا جاتا ہے لیکن چُپ چاپ
جیسے خاموشیِ صحرا سے اُلجھنے سے ڈرے

٭

پرلے ساحل پہ مچھیروں کی کسی بستی میں
جاگتے جاتے ہیں مٹی کے تنک تاب دیئے
کوئی دم جاگ کے تھک جائیں گے سو جائیں گے
کون اس رات کو پایانِ سحر تک پہنچائے

زرد رُو چاند تھکے ہارے مسافر کی طرح
منزلِ دُور کی راہوں کے تصوّر سے اداس
مطلعِ شرق سے اُبھرا ہے پریشاں حیراں
دشتِ ویراں میں کھجوروں کے کسی جھنڈ کے پاس

اور کسی مرقدِ بشکستہ کے گنبد میں کہیں
دوش و امروز کی گردش کا ستایا ہوُا بُوم
آلِ برمک، بنی عباس کے نوحے گاتا
کیوں دبک جاتا ہے یکبارگی کس کو معلوم

اِک عجب کیفیتِ خواب مسلّط ہے یہاں
شورِ ماتم ہے کہیں سمت نہ شادی کا خروش
اپنی دنیائے کشاکش کو میسّر ہیں کہاں
خُنکیِ شام میں بھیگے ہوئے لمحاتِ خموش

دِن مشقت میں کٹیں، راتیں ستارے گنتے
صبحیں آئیں غمِ تازہ کے سندیسے لے کر
رُوحِ بے مہریِ اوقات کا محور بن جائے

جانے کب تک ہے یہی سلسلۂ شام و سحر

شاہزادوں ہی کی جاگیر ہیں سارے انعام
اپنی قسمت ہے فقط خار کشی، محرُومی
کچھ اسی دور میں دیکھا ہے یہ رنگِ ایّام
زندگی پہلے زمانوں میں تو دُشوار نہ تھی

ہائے کیا دن تھے، میسّر تھا ہر انساں کو فراغ
چشمِ قدرت کی عنایت پہ جیا کرتے تھے
سب کی جیبوں میں ہوا کرتے تھے جادو کے چراغ
جن سبھی کام سرانجام دیا کرتے تھے

حکم ملتے ہی بنا دیتے تھے بگڑی ہُوئی بات
عیشِ جاوید میں آنے نہیں پاتا تھا خلل
لا کے پہلو میں بٹھا دیتے تھے محبوب کی سیج
رات کی رات میں چُن دیتے تھے مرمر کے محل

خضر و الیاس خلاؤں سے ٹپک پڑتے تھے
آیا کرتا تھا کڑا وقت کسی پر جو کبھی
جی میں آئی تو ہُوئے دیدۂ حیراں سے اوپ
سیم کی شہپرِ شہرُخ پہ زمانے بھر کی

پیٹ بھُوکا تھا کوئی اور نہ برہنہ کوئی جسم

کس کو مزدوری و محنت کی پریشانی تھی
قاضیِ ایں ہمہ حاجات تھا سم سم کا طلسم
بادآورد خزانوں کی فراوانی تھی

ہم نے دیکھا ہے مچھیروں نے جو ڈالا کبھی جال
دجلہ سے عہدِ سلیماں کے خزینے نکلے
اپنی تقدیر پہ کورانہ بھروسے کے طفیل
کتنے جہّال سرِ بامِ امارت پہنچے

دیکھتے دیکھتے افلاس لکڑہاروں کا
شوکت و شانِ وزارت میں بدل جاتا تھا
اسمِ اعظم کی کرامت تھی جہانگیر ایسی
سایہ ادبار کا اک آن میں ٹل جاتا تھا

شہر میں آئے جو محروم جو مسافر کوئی
لوگ اُسے شہر کا سلطان بنا لیتے تھے
تاج رکھتے تھے سرِ فرق بصد عجز و نیاز
اپنا آقا بہ دل و جان بنا لیتے تھے
بادشہ زادیاں قدموں میں بچھی رہتی تھیں
دُور از دست نہ تھے قاف کی حوروں کے پرے
اپنے محلوں میں چھپا لیتی تھیں لاکر پریاں
ابنِ آدم جو اکیلے میں کہیں مل جاتے

اپنا یہ عالمِ بے رنگ بھی عالم ہے کوئی
آؤ کچھ دیر انہی خوابوں کے جزیروں میں چلیں
ڈھونڈیں بغدادِ کہن سال کی گلیوں میں سکوں
اوجِ افسانہ پہ جادو کے کھٹولے میں اُڑیں

کتنی شب بیت گئی دجلہ کی ساکن موجو
آدھی بیتی ہے کہ ہے پچھلے پہر کا ہنگام
کشتِ انجم سے گزرتا ہوا مغرب کی طرف
منزلیں طے کیے جاتا ہے مہِ سست خرام

چادرِ خواب میں لپٹا ہے جہانِ موجود
الف لیلہ کے فسانوں کا جہاں ہے آباد
شہرِ رومان کے ہنگاموں کا عالم ہے وہی
پھر وہی شورِ خلائق ہے بسوق و بازار

پھر انہی رندوں کے جھرمٹ میں خرابات کے گرد
کہنہ حجروں میں کھنکتے ہیں وہی جام و سبو
قصرِ شاہی کے جھروکوں میں پریشاں ہیں ادھر
ماہ رخسار کنیزوں کے گھنیرے گیسو

شورِ نغمہ ہے زبیدہ کے شبستاں میں بلند
عود و عنبر کا تعطّر ہے فضا میں ساری
سُونے ایوانوں میں پائل کے چھناکے گونجے

چھم چھما چھم - چھما چھم - رقص ہوا ہے جاری

(کوئی غیرتِ ناہید قیامت بردوش
اپنا سرمایۂ اعجاز سمیٹے آئی
ساز بیدار ہوئے - جھانجھ نے پہلو بدلے)
اور مغنّی نے غزل دھیمے سُروں میں چھیڑی

اے دلِ اندیشۂ آلام نہ کر آج کی رات
ان کے چتون کے اشارے ہیں ادھر آج کی رات

دیکھنا ہے شبِ عشرت کی نہایت کیا ہے
بزم اُٹھتی ہے کہ ہوتی ہے سحر آج کی رات

ایسے عالم میں قیامت کا نہ چھیڑو مذکور
قدرِ ایماں سمجھتے ہیں، مگر آج کی رات

زاہدو جام پیو، خُلد کی حسرت چھوڑو
ساقیوں پہ بھی احساں کی نظر آج کی رات

دل کو برماؤ ستاروں پہ کمندیں ڈالو
رقص فرماؤ باندازِ دِگر آج کی رات

رُک گئی گیت کی لَے، تھم گئی پائل کی چھنک

رقصِ پیمانہ و مینا کی ہوئی تیاری
اِک طرف عرقِ مئے ناب ہوئے ظلّ اللہ
مایۂ ہوش اُدھر ہار گئے درباری

اور ڈیوڑھی پہ کھڑا ایک غلامِ زنگی
اپنی دُنیائے تصوّر میں کہیں کھو یا گیا
آہیں بھرنے لگا اُمڈے ہوئے آنسو روکے
بیٹھے بیٹھے اسے کیا جانئے کیا یاد آیا!

اس کے خوابوں کی سیہ چہرہ پری رہتی ہے
ارضِ تاریک حبش کی کسی وادی میں کہیں
اُڑ کے جاتے اسے سینے سے لگا لے لیکن
آج اِک جنسِ تجارت ہے یہ انساں تو نہیں

یہ بھی دنیا ہے دُہی - آؤ کہیں اور چلیں
ہم تو آئے تھے اسی درد سے ڈرتے بچتے
سسکیاں گیت کی لَے سے ہیں گلوگیر یہاں
گرم اشکوں میں شرابور ہیں رعنا چہرے

کون بیٹھا ہے وہ دیکھیں تو سرِ راہگذار
ہے اسی شہر کا باسی کہ مسافر کوئی
اپنے وعدے کو نبھائے گی کوئی مہر نگار؟
کس کی رہ دیکھ رہا ہے ذرا پوچھیں تو بھی

بوالحسن نام کا اپنا یہ وہی دوست نہ ہو
آنکلتا تھا جو ہر شام سرِ راہگذار
جستجو دل میں کسی اجنبی مہماں کی لیے
اس کی یہ وضع معیّن تھی خزاں ہو کہ بہار

بھیس میں تاجرِ موصل کے خلیفہ ہاروں
ایک شب اُس کے شبستاں میں جو آ کر ٹھہرا
کھا کے یک روزہ خلافت کا فریب سیمیں
یہ بچارا کسی مجلس میں نظر آیا تھا

دیکھنا ظلِّ الٰہی کی سواری آئی
راستہ چھوڑ دو کہ سلطانِ جہاں آتے ہیں
ساتھ لشکر ہے ندیموں کا خراماں بہ ادب
سر پہ طاؤس و ہما سایہ کناں آتے ہیں

دھول مٹی میں سنے کیڑو مکوڑو رستہ
بندگی پیشہ غلاموں کے گروہو چھٹ جاؤ
اپنی منحوس جبینوں کو چھپا لو فوراً
شاہِ دوراں کی نگاہوں سے پرے ہٹ جاؤ

دُور وادی میں نظر آتی ہے اُونچے اُونچے
سبز پریوں کے محلات کی دھندلی سی قطار
آؤ کچھ دیر وہیں چل کے ذرا ستا لیں

کچھ تو ہو خاطرِ درماندہ کو سامانِ قرار

شہرِ مسحور نہ پڑتا ہو مگر رستے میں
جس کے بازار میں خاموش بہائم سے پٹے
ایک دن یہ بھی انساں تھے مگر آج نہیں
کس میں ہمت ہے کہ اس سحرِ گراں کو توڑے

کتنے مہ پاروں کے جھرمٹ میں حرم کی رونق
بجتے ہیں چاند سے جسموں پہ مرصّع گہنے
جمع ہیں خدمتِ اقدس میں لزاد رکیا کیا
ظلِّ سبحانی کی شوکت کے تو پھر کیا کہنے

چیخ کس کی یہ سرِ بامِ فلک جا پہنچی
کون برسوں کی تمنّا سے لپٹ کر رویا
پہلوئے شاہ میں کس کس کا جگر گوشہ ہے
کتنی کٹیا ئیں اُجڑ کر حرم آباد ہوا

دردِ خوابیدہ کی ٹیسیں بھی تو جاگ اُٹھتی ہیں
عشرتِ روح کا ساماں نظر آتا ہے جہاں
ایک کانٹا بھی تو چبھ جاتا ہے چپکے سے کہیں
پھول نکہت بکھیریاں نظر آتا ہے جہاں

شہرِ رومان پہ چھایا ہے وہی رنگِ ملال

جس سے انساں کو مفر عالمِ امکاں میں نہیں
سند باد آئے۔ مگر سخت طوفاں کے ستائے
تسمہ پاؤں کی اسیری میں دل افگار و حزیں

کس کی محفل میں یہ لے آئی ہے اب کے اُفتاد
بزمِ ہاروں تو نہیں حاجب در سے پوچھیں
ہر کوئی اُٹھ کے سُناتا ہے کہانی اپنی
ہم بھی اس حلقے میں چل کے ذرا بیٹھیں دیکھیں

ظلِ سبحانی ترا مرتبہ قائم دائم
تجھ کو اللہ سلیماں کا منصب بخشے
میں بھی اس شہر کے بازاروں میں نوواردِ ہوں
میری باری ہے تو میری بھی حکایت سُن لے

میں کسی شہر کا تاجر ہوں نہ والی نہ وزیر
نہ کسی شاہ معاصر کا جگر گوشہ ہوں
نہ کسی بادشہ زادی کی محبت کا اسیر
سر میں سودائے سیاحت ہے نہ کچھ اور جنوں

میں وہ دہقاں تھا جو کھیتوں میں اگاتا ہے اناج
فصل پکنے پہ سمجھتا ہے کہ محنت بر آئی
یہ مگر تیرا کہیں تیرے پیادوں کا خراج
میں جو کھلیان سے دامن لیے اٹھا خالی

آج مزدور ہوں اک تیل کے مِل کا مزدور
اور اس جہدِ شب و روز سے پایا کیا ہے
خود تہیدست ہوں، خواجہ کے خزانے بھرپور
اب میں یہ پوچھنے آیا ہوں۔ یہ دنیا کیا ہے؟

کیا مجھے پرچم کا وہ لٹنے آنا ہوگا
کیا تجھی ہوش میں آئے گی خلافت تیری
کیوں تری بزم ہوئی جاتی ہے درہم برہم
ظلِّ سبحانی مری بات تو سُن لی ہوتی

نرم بالو کا بچھونا ہے خنک اور مرطوب
چاند مغرب میں بہت دور کہیں جا پہنچا
سطحِ دجلہ پہ گزر ہے نہ محلہ کوئی
نوحہ خواں بُوم بھی مدت ہوئی خاموش ہوا

گھنٹیاں بجتی ہیں، گرد اُڑتی ہے، شور اُٹھتا ہے
کارواں موصل و شیراز کے آتے ہوں گے
مشہد و یزد و صفاہاں کے امیروں کے سفیر
تحفے ہر ملک کے ہر دیس کے لاتے ہوں گے

یا ہلاکو کے عساکر کا ہراول ہوگا
جس نے تسخیرِ ممالک کے عزائم لے کر
آج بغداد کے ایوانوں کو تاکا ہوگا!

اب کوئی دم میں ہوا جاتا ہے سب زیر و زبر

کیا مگر اس سے بدل جائیں گے اپنے ایّام!
ہوں وہ مستعصم و ہارون کہ ہلاکو کوئی
جب تک اس نہج پہ چلتا ہے زمانے کا نظام
کون کہتا ہے بدل سکتی ہے قسمت اپنی

کوئی موہوم سی اس آس پہ کب تک جی لے
ٹھہرو اب کوئی فرستادۂ غیب آئے گا
آ کے توڑے گا وہ افلاس کے غم کے بندھن
(پر جو مہدی کی بجائے وہ ہلاکو نکلا)

ابنِ آدم کا جہاں - ہبطِ ازل کا مہبط
قیدِ غم سے کبھی آزاد بھی ہوگا کہ نہیں
حسرتیں دل میں پلے جائیں گی کب تک آخر
یہ خرابہ کبھی آباد بھی ہو گا کہ نہیں؟

اب تو لو پو بھی پھٹی - نُور کا تڑکا بھی ہوا
(اور میں اب تک یہیں بیٹھا ہوں یہ عالم کیا ہے؟)
رات کے آخری تاروں کا وداع خاموش
صبحِ تازہ کی ولادت کا پتا دیتا ہے

اور کسی پاس کی بستی میں مؤذّن کوئی

اہلِ ایماں کو بلاتا ہے جماعت کے لیے
اس کی آواز کا یہ سحرِ ترنّم - یہ گداز
دل سے کہتا ہے یہاں سے نہ اٹھاؤ ڈیرے

دُور اک ریل کے انجن کی پریشاں سیٹی
چیخ اُٹھی ہے کہ تعطیل کے دن ختم ہوئے
آج ہی رختِ سفر باندھ کے جانا ہو گا
منتظر بیٹھے ہیں کرکوک میں افسر میرے

پھر وہی سر بفلک دود کشوں کی دُنیا
پھر وہی تیل کے چشموں کی فضائے بودار
پھر وہی سلسلۂ جہدِ گراں، مزدِ قلیل
اور وہی محل میں خواجہ کے طلا کے انبار

اور یہ خواجہ کہیں افرنگی، کہیں امریکی
جس کی صد رنگ سیاست کا طلسم سیمیں
تمہ پا بن کے ہے مشرق کی فضاؤں پہ سوار
کب تک اس سحر کا معمول رہے گی یہ زمیں

شہزادوں کے تخیّل کا وہ بغداد کہاں
نفت و روغن کی سیاست ہے فضاؤں میں رچی
بھیس میں تیل کے تاجر کے نکل آتا ہے
اب بھی بغداد کی گلیوں میں خلیفہ کوئی

کوئی اِس تاجرِ معصوم کے حیلے دیکھے
صاحبِ خانہ بنا جاتا ہے کل کا مہماں
چام کے دام چلاتے ہیں اجارے اس کے
نام ہارون کا ہو، فیصل کا ہو زیبِ عنواں

اب بخارا و سمرقند کی راہوں سے کبھی
پھر یلغار نہ آئیں گے ہلاکو کے مغول
آج کی دنیا ہے لارنس و کلب کی دُنیا
آج تسخیرِ ممالک کے ہیں کچھ اور اصول

ابروئے سام کا ادنیٰ سا اشارہ ہو اگر
قومیں بک جاتی ہیں اور تخت الٹ جاتے ہیں
عظمتِ دہلی و ایتھنز تو افسانہ ہوئی
ہند و یونان اسی حاتم کا دیا کھاتے ہیں

بصرہ و موصل و بغداد ہیں اس کی جاگیر
روم و مصر اس کے ہیں نجد اس کا ہے شام اس کا ہے
اس کے سکّے کے طفیل ایک جہاں میں آشوب
آج بغداد کا ہارون بھی غلام اس کا ہے

حرفِ ڈالر کی کرامت ہے کچھ ایسی بلوان
حرفِ سم سم کا فسوں گرد ہوا جاتا ہے
کچے دھاگے میں بندھی آتی ہیں سرکاریں سبھی

تیل دھرتی کی ہر اک نس سے کھنچا آتا ہے

سیلِ انوارِ سحر پھیل چلا ہر جانب
آخرِ شب کے دھندلکوں کا فسوں بھی ٹوٹا
اب تو بہتر ہے کہ بستی کی طرف لوٹ چلوں
آج ہی رختِ سفر باندھ کے جانا جو ہوا

دل کے اُلجھے ہوئے احوال کو سلجھا نہ سکے
شہرِ ہارون کے یہ پُر پیچ مسقّف بازار
میں سرائے سے جو نکلا تو پھرا سُوق بسُوق
پھر بھی چھایا رہا دل پر وہی بے نام غبار

قہوہ خانے میں جو پل بھر کے لیے جا بیٹھیں
آنکلتا ہے اِک آوارہ گداؤں کا ہجوم
گونج اُٹھتا ہے اِک آوازۂ شیئاً للہ
گھول دیتا ہے جو ہر جرعۂ قہوہ میں زقوم

شہر و صحرا میں پلے جائے گی کب تک یہی بھوک
عام کب ہوں گے الہ دین کے جادو کے چراغ
کوئی شہزادہ نہ لائے گا کوئی ردِّ طلسم؟
کوئی انسان کو بتائے گا کوئی راہِ فراغ؟

اب بخارا و سمرقند کی راہوں سے نسیم

لایا کرتی ہے دمِ صبح بہاروں کے پیام
اور ہر پھول سے کہہ جاتی ہے چپکے چپکے
تم بھی چاہو تو بدل سکتے ہو گلشن کا نظام

تم کو آدم کے مقدر کے جگانے کے لیے
بابل و نینوا کے ساحر نہ بلانے ہوں گے
مصر و بغداد کی بگڑی کے بنانے کے لیے
مصر و بغداد کے جمہور جگانے ہوں گے

ورنہ کچھ سوچ کے پھرتا ہی رہے گا آ ہیں
شاہی ڈیوڑھی پہ سیہ بخت غلامِ زنگی
اور ہر موڑ پہ آوازۂ "شیئاً للّٰہ" !
ہر مسافر کے تعاقب میں رہے گا یونہی

ابن انشاء کا وہ تمتماتا ہوا چہرہ مجھے آج بھی یاد ہے جب اُس نے نظم سنانے کے بعد اپنی مخصوص مدھم سی شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا تھا۔

"ارے! چائے تو ٹھنڈی ہو گئی"

"اور منگواتا ہوں"

اس طویل نظم نے مجھے اپنے طلسم میں قید کر لیا تھا۔ ابن انشاء بڑی سادگی اور بے ساختگی سے نظم سناتا چلا گیا تھا اور اس کا طلسم میرے اردگرد اپنا جالا بنتا چلا گیا تھا۔ مجھے دجلہ اور فرات کی وادی کے وہ داستان گو یاد آ رہے تھے جو ستاروں کی چھاؤں میں پرانی سراؤں کے باہر قالینوں پر بیٹھے مصر و یونان کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ مجھے زبیدہ کے شبستان میں سُلگتے عود و عنبر کی مہک

بھی آ رہی تھی اور ارضِ حبش کے غلاموں کی سسکیاں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اس نظم میں رومانیت اور حقیقت پسندی کے تصادم سے پیدا ہونے والا ابن انشاء کا فن اپنے عروج پر تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن انشاء یہ نظم دو تین برس سے لکھ رہا تھا اور بیچ میں کبھی کبھی اُس نے مجھے اس کے کچھ بند سنائے بھی تھے لیکن پوری نظم اُسی روز میں نے سُنی۔ میں ابن انشاء کے لیے چائے کی دوسری پیالی بنانے لگا تو اس کی خوشبو نے ملکہ زبیدہ کے شبستان میں سُلگتے عود و عنبر کی مہک سے مل کر مجھ پر جادو کر دیا۔ گرم سنہری چائے پیالی میں گر رہی تھی۔ ڈوبتے سورج کی سیال کرنیں پیالی میں گردش کر رہی تھیں۔ بغداد کی ایک رات، چائے کی پیالی میں سمٹ آئی تھی۔ میں نے پیالی ابن انشاء کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"تمہاری نظم سُن کر میرے کان گرم ہو گئے ہیں"

ایک خوش پوش نوجوان اپنے اوورکوٹ پر سے بارش کے قطرے جھاڑتا ریستوران میں داخل ہوا۔ باہر بارش شروع ہو گئی تھی۔ بغداد کی ایک رات، لارنس باغ کے گھنے درختوں پر گرتی بارش اور مال روڈ پر پھیلی دھند اور لونگز کی خوشبودار گرم چائے اور کریون اے کا گہرا پُر اسرار انگلش فلیور ——— میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"ابن انشاء! یہ دن مجھے یاد رہے گا"

لیکن اُس دن کو یاد کر کے آج میری آنکھوں میں آنسو آ جائیں گے یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

ابن انشاء یقیناً ہر شخص کے پاس اپنی یادوں کے ایسے چراغ جلا کر چھوڑ گیا ہے جن کی لَو کبھی مدھم نہ ہو گی۔ جن کی روشنی کبھی کم نہ ہو گی۔ میری زندگی کا ایک گوشہ بھی اُس کی یادوں کی روشنی سے منوّر ہے۔ میں اس کی آواز بھی سُنتا ہوں اور اُسے اپنے سامنے بھی دیکھتا ہوں۔ کبھی کان میں دیا سلائی پھیرتے ہوئے کبھی منہ کھول کر دانت پر دوائی لگاتے ہوئے کبھی چپکے سے میری مٹھی میں چلغوزے تھماتے ہوئے کبھی گال پھلا کر اس پر سیفٹی ریزر چلاتے ہوئے۔ کبھی بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے۔ کبھی عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے۔ کبھی جیب سے قلم نکال کر اُسے کھولتے ہوئے۔ کبھی نچلا ہونٹ ٹیڑھا کر شرارت سے مسکراتے ہوئے۔ کبھی میرے سامنے بیٹھے چائے پیتے ہوئے اور کبھی لاہور کی پُراسرار گلیوں کی مٹرگشت کرتے ہوئے اور کبھی مجھے گورکی کی آپ بیتی سناتے ہوئے۔ کبھی اُس کی آواز سُنتا ہوں اور پلٹ کر دیکھتا ہوں تو اُس کی شکل دکھائی نہیں دیتی۔ کبھی اُسے اپنے سامنے دیکھتا ہوں اور اُس کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اُس کے ہونٹ ہل رہے ہیں، لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ کبھی اُس کی آواز بھی سُنتا ہوں اور اُسکی شکل بھی دیکھتا ہوں۔

مال روڈ کی بارش میں گزرتی دو منزلہ بس۔ پرانے مکانوں کی کابکوں میں غٹرغوں کرتے کبوتروں کی آوازیں۔ پاک ٹی ہاؤس میں گونجتے قہقہے۔ لورینگر کے گملوں میں بجی یوکلپٹس کی شاخوں کی سرگوشیاں اور لارنس باغ کے سُرخ

گلابوں کے شبنمی مکھڑے ـــــ یہ سب انشاء کی یادوں کی نشانیاں ہیں۔ اُس کی یادوں کے قطب نما ہیں اور یہ سب نشانیاں، یہ سارے قطب نما مجھے ابن انشاء کی طرف ہی لے جاتے ہیں۔ لاہور کی ہر گلی ابن انشاء کے مکان کو جاتی ہے۔ اسی مکان کی یاد دلاتی ہے۔ لارنس باغ کے درختوں پر اُس کی یادیں کندہ ہیں۔ پاک ٹی ہاؤس کی فضا میں اس کی خاموش آوازوں کی تھرتھراہٹ ہے اور لاہور کے آسمان پر طلوع ہونے والا چاند اور ابن انشاء کے مکان کے آنگن والا پیپل کا پیڑ آج بھی اُسے یاد کرتا ہے۔ زرد پتے گرتے ہیں تو ہوا انہیں اڑا کر لے جاتی ہے۔ وہ دُور تک پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں، لیکن ابن انشاء کے مکان کا آنگن خالی ہے۔

اب میں ابن انشاء کو میکسم گورکی کی آپ بیتی پڑھتے دیکھتا ہوں۔ اس کتاب کے ہم دونوں متوالے تھے۔ بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا مزا انگریزی میں ہی آتا ہے۔ بعض کتابوں کے اردو ترجمے ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں انگریزی یا کسی دوسری زبان میں پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ گورکی کی آپ بیتی بھی ان ہی کتابوں میں سے ہے۔ میکسم گورکی کی آپ بیتی کا اردو ترجمہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے تین جلدوں میں کیا اور اسے انجمن ترقی اردو (ہند) نے چھاپا۔ میرے پاس اس کی تینوں جلدیں تھیں۔ اب دو جلدیں رہ گئی ہیں۔ تیسرا حصہ مجھ سے ابن انشاء نے لیا تھا۔

ابن انشاء نے میری ایک کتاب کے فلیپ پر ایک جگہ لکھا تھا: "اے حمید کی تحریر میں امرتسر کے قبرستان کے مولسری کے درختوں، راجدھرہ کے عشق، برما اور لنکا کے گل کوچوں، پام درختوں، ایرانی قالینوں، سماواروں ..... اور سیماب وش چنچل طبیعت کا بھی اتنا ہی دخل ہے جتنا گورکی کی آپ بیتی کے ایک ہزار بار پڑھنے کا ..... وہ ہر چیز کو ننگی آنکھ سے دیکھنے کا قائل ہے۔ وہ انسان کی رگوں سے بھی واقف ہے اور دمِ صبح لہلہانے والے اور کھلنے والے پتوں کی رگوں سے بھی۔ ہر دور کو ایک نہ ایک حزیں ہارڈی اور رومانی کرشن چندر کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج کا ایسا قلمکار ہمارا اے حمید ہے۔"

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے گورکی کی 'آپ بیتی' کا ترجمہ اس کمال سے کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے گویا گورکی نے یہ کتاب اُردو زبان میں لکھی ہو۔ ہم یہ کتاب بڑے مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ ابن انشاء کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے سر ہلا کر مسکرائے جاتا۔ پھر کسی مقام پر رُک کر کوئی ٹکڑا سنانا شروع کر دیتا۔

"جب آئے دن کے جھگڑے ستاتے یا غم مجھے نڈھال کر دیتا تو میں اپنے لیے آپ دعائیں نظم کر لیا کرتا تھا۔ الفاظ ایک فریاد کی صورت میں مرتب ہو جاتے۔

اللہ میں ہوں کتنا دُکھیا
مجھ کو جھٹ پٹ بڑا بنا دے
جلدی یہ سب پاپ کٹا دے
جینا ہے دشوار ۔ اللہ جینا ہے جنجال
یہ بڑھیا شیطان کی خالہ
سر پہ لئے کھڑی ہے جالا
کیسی مصیبت سے ہے پالا
جینا ہے دشوار، اللہ جینا ہے جنجال

جب راتیں خوشگوار ہوتیں تو مجھے شہر کی سڑکوں کی سرگشت کرنے میں لطف آتا تھا۔ میں تاریک اور سنسان گوشوں میں پھرا کرتا۔ کبھی یوں پھسلتا چلا جاتا گویا پَر نکل آئے ہیں اور میں چاند کے ساتھ آکاش میں تیر رہا ہوں۔ میرا سایہ سامنے لڑھکتا چلتا، برف پر بجھتی ہوئی روشنی کی کرنوں کو ڈھانکتے اور مضحکہ خیز طریقے سے لہراتے بل کھاتے ہوئے ــ چوکیدار ہاتھ میں ڈنڈا لیے، بھیڑ کی کھال پہنے، ایک کُتّے کے ساتھ ساتھ گلی کوچوں کا چکّر کاٹا کرتا۔ مکانوں سے آدمی نکل کر سڑکوں پر گم ہو جاتے اور کُتا ان کے پیچھے لپک پڑتا۔ کبھی کبھی رنگیلی

حسینوں کا جھرمٹ عاشقوں کی ٹولی کے ساتھ محوِ خرام ہوتا اور مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میری طرح یہ بھی کلیسا سے نکل آتی ہیں۔ کبھی کسی روشن دان سے ایک عجیب قسم کی مہک آتی جو کسی ایسی زندگی کا پتا دیتی جس سے میں ہنوز نامانوس تھا۔ میں کھڑکی کے پاس رُک کر اس مہک کو خوب سونگھتا اور سوچنے لگتا کہ اس مکان کے لوگ کس طرح رہتے بستے ہیں۔"

(گورکی کی آپ بیتی)

اب سنانے کی میری باری ہوتی۔ میں ابن انشاء کے ہاتھ سے کتاب لے کر اس کی ورق گردانی کرنے لگتا۔ پھر کسی مقام پر رُک کر پڑھنے لگتا۔

"وہ پگڈنڈی کے کنارے بیٹھی تھی۔ ایک رومال پر اُس نے روتی ککڑی اور سیب پھیلا رکھے تھے۔ اُن کے بیچ میں شیشے کا بہت ہی خوبصورت ساغر رکھا ہوا تھا۔ اُس کے مُنہ بند پر نپولین کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ نانی نے فرطِ احسان مندی سے کہا۔

'الہیٰ کیسا سہانا سماں ہے،'

'میں نے ایک گیت بنایا ہے،'

'خوب! میں بھی تو سنوں،'

میں نے اُسے اپنی نظم بند سنائی۔

گرمی کے سورج الوداع
تو ہم سے ہوتا ہے جُدا
جاڑے کا موسم آ گیا
میں دیکھتا ہوں برملا

نانی نے سُنی ان سُنی کر کے کہا۔

'مجھے بھی ایک ایسا گیت یاد ہے۔

پھر وہ گنگنانے لگی۔

گرمیوں کا سورج چلا سکھی
جھاڑیوں کی اوٹ میں سونے کو
میں ساجن بن رہ گئی سکھی
بسنت کی رین میں رونے کو
جب بھور بھئی میں اکیلی تھی
پھولوں کی جان کو رونے کو
کھیتوں میں کس کے سنگ پھروں
جب دی ہو جوانی کھونے کو
میری اچھی سکھی میری پیاری سکھی
میرے دل کو نکال لے سینے سے
اور برف میں کر دے دفن اِسے
کیا مجھ کو ملے گا جینے سے

نانی نے کہا۔ "یہ ہے دکھے دل کی آہ۔ یہ کسی کنواری کا بنایا ہوا گیت ہے۔ بیچاری نے بہار کے مزے بھی نہ لوٹے تھے کہ اس کے پیارے نے بے وفائی کی اور شاید کوئی دوسرا گھر ڈھونڈ لیا۔ یہ بیراگن دکھ کے مارے رونے لگی۔ جب تک اپنے پر نہ بیتے سچائی اور صفائی سے بیان نہیں ہو سکتا۔ دیکھو اس دل جلی کے گیت میں کیسی تاثیر ہے۔"

(گورکی کی آپ بیتی)

یہ کمال اختر حسین رائے پوری کے ترجمے کا تھا کہ ہم پڑھتے پڑھتے اس میں کھو جاتے۔ ہمیں کتاب کے کردار اپنے سامنے چلتے پھرتے ہنستے مسکراتے، باتیں کرتے، لڑتے جھگڑتے نظر آتے۔ ہم نے ایک بار گورکی کی آپ بیتی کے انگریزی ترجمے کی تینوں جلدیں نکلوا کر جگہ جگہ سے اپنے پسندیدہ ٹکڑے نکال کر پڑھے۔ ہمیں

ذرا مزہ نہ آیا۔ ہم نے ماسکو پبلشنگ ہاؤس والوں کا چھاپا ہوا اردو ترجمہ بھی دیکھا مگر ؎

وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

اس کتاب کی تیسری جلد میں گورکی نے دو نوعمر لڑکوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک کا نام چڑکا ہے۔ دوسرے کا نام ٹُنکا۔ دونوں بڑے کم سخن اور غمگین سے لڑکے ہیں۔ شرارت بھی کرتے ہیں تو بڑی دھیمی دھیمی اور اُداس۔ چڑکا، قبرستان کی دیوار پر بیٹھے کوؤں کو دیکھتا رہتا ہے اور ٹُنکا کھڑکی کے شیشے سے لگا، گاؤں کی پگ ڈنڈی پر اڑتی دھول کو اداس نظروں سے دیکھا کرتا ہے۔ ہمیں یہ کردار جانے کیوں پسند آ گئے۔ چنانچہ ہم نے ان کے ناموں پر اپنے نام رکھ لیے۔ میں ٹُنکا بن گیا اور ابن انشاء چڑکا بن گیا۔ اُن دنوں ابن انشاء کراچی چلا گیا۔ وہ مجھے پیارے ٹُنکا کہہ کر خط لکھتا اور میں اُسے پیارے چڑکا کہہ کر خط لکھتا۔ اس زمانے کے کچھ یادگار خط اس کتاب کے آخر میں آپ پڑھیں گے۔

افسوس اب نہ چڑکا مجھے خط لکھے گا اور نہ ٹُنکا اُسے جواب دے سکے گا۔ چڑکا قبرستان کی دیوار پر بیٹھے کوؤں کو دیکھتے دیکھتے قبرستان میں کہیں کھو گیا اور ٹُنکا اپنے گھر کی کھڑکی کے شیشے سے لگا اداس نظروں سے قبرستان کی خالی دیوار کو دیکھ رہا ہے۔

اس زمانے کا لارنس باغ اور آج کل کا باغ جناح، لاہور کا خوبصورت ترین باغ ہے۔ ہم اس باغ میں اکثر سیر گشت کرنے جایا کرتے۔ یوں تو اس باغ میں بے شمار گھنے سایہ دار خوبصورت درخت ہیں، لیکن ابن انشا کو ایک درخت بہت پسند تھا۔ یہ درخت باغ کے جنوب میں ریس کورس والی گراؤنڈ کے کونے میں واقع ہے۔ املتاس کا درخت ہے جس پر مئی کے مہینے میں پھول آتے ہیں۔ زرد پھولوں کے لمبوترے گچھے فانوسوں کی طرح شاخوں میں جگہ جگہ لٹکنے لگتے ہیں۔ زرد روشنی کا خوشبودار غبار درخت کو چاروں طرف سے لپیٹ لیتا ہے۔ ہم ذرا

تیز چلتی ہے تو پھولوں کی زرد ننھی ننھی پنکھڑیاں زمین پر گرنا شروع ہو جاتی ہیں۔ مئی کے مہینے کی گرم ہوا میں یہ گرتی زرد پنکھڑیاں بڑی بھلی لگتیں۔ لارنس باغ میں چلتی گرم لُو املتاس کے اس درخت کی گھنی چھاؤں میں پہنچ کر خنک ہو جاتی۔ میں اور ابن انشاء املتاس کی چھاؤں میں بیٹھے گھاس اور گلاب کے پھولوں پر اڑتی تتلیوں کو دیکھا کرتے۔ کبھی ہم گھاس پر لیٹ کر اپنے اوپر لٹکتے املتاس کے زرد پھولوں کو دیکھتے جو ہوا میں چینی فانوس کی طرح لہرا رہے ہوتے۔ ابن انشاء کہتا۔

"مجھے ان پھولوں کو دیکھ کر چینی فانوس کا خیال آتا ہے۔"

اور میں کہتا۔

"مجھے یوں لگتا ہے جیسے انگور کے زرد گچھے لٹک رہے ہیں۔"

جب ہم اٹھتے تو ہماری قمیصوں پر سے زرد پنکھڑیاں گرتیں۔

ایک دن میں ابن انشاء کے گھر گیا تو وہ بڑا خوش خوش تھا اور بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔ دن گرم تھا اور دھوپ میں صبح ہی سے حدت آ گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"آج بڑے خوش ہو۔ کیا بات ہے؟"

وہ مسکراتا رہا اور بالوں میں کنگھی کرتا رہا۔ پھر بش شرٹ کا کالر ٹھیک کرتے ہوئے مجھے ساتھ لے کر گھر سے باہر آ گیا۔

"چلو اپنے درخت کے پاس چلتے ہیں۔ رات ایک نظم ہو گئی ہے۔ درخت کو چل کر سناتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"درخت کو سناؤ گے یا مجھے؟"

"پگلے تم بھی ساتھ ہی سنتے جانا۔"

ہم منٹگمری روڈ سے ہوتے ہوئے لارنس باغ میں آ گئے۔ یہاں درختوں کی وجہ

سے قدرے خنکی تھی۔ ہم خانہ کلب کے عقب سے نکلے تو سامنے گراؤنڈ میں املتاس کا درخت دکھائی دیا۔ اس کی شاخیں زرد پھولوں کے چینی فانوس لٹکائے دُور سے ہمیں اپنے پاس بلا رہی تھیں۔ ہم درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ ابن انشاء نے بش شرٹ کی جیب سے کاغذ نکال کر کھولا اور مجھے اپنی نظم سنانے لگا۔ نظم کا عنوان ابھی اُس نے نہیں رکھا تھا۔ بعد میں یہ نظم "پچھلے پہر کے سناٹے میں" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ نظم یہ ہے۔

پچھلے پہر کے سناٹے میں
کس کی سسکی، کس کا نالہ
کمرے کی خاموش فضا میں در آیا ہے
زور ہوا کا ٹوٹ چکا ہے
کھلے دریچے کی جالی سے
ننھی ننھی بوندیں چھن کر
سب کونوں میں پھیل گئی ہیں
اور مرے اشکوں سے
ان کے ہاتھ کا تکیہ بھیگ گیا ہے

کتنی ظالم
کتنی گہری تاریکی ہے
کھلا دریچہ تھر تھر کانپ رہا ہے
بھیگی مٹی سوندھی خوشبو چھوڑ رہی ہے
ابر کے ٹکڑے، سورج کے بادل، یادوں کے تارے
کالے امبر کی جھیلوں میں ڈوب گئے ہیں
کس کے رخساروں کی لرزش دیکھ رہا ہوں

کس کی زلفوں کی شکنوں سے کھیل رہا ہوں
چپکے چپکے لیٹے لیٹے سوچ رہا ہوں
پچھلے پہر کا سناٹا ہے
کس کی سسکی، کس کا نالہ
کمرے کی خاموش فضا میں در آیا ہے

گھنے درختوں میں پُروا کی سیٹی گونجی
دود کشوں میں قیدی روحیں چیخ رہی ہیں
محرابوں سے بھوتوں کے سر ٹکراتے ہیں
قلعے کے ایک بُرج کے اندر
ایک پری —— شیلاٹ کی رانی
خندق کے ان دیکھے پانی کی گہرائی
اندیشے کے بالشتوں سے ماپ رہی ہے
پچھلے پہر کے سناٹے میں
کس کی سسکی کس کا نالہ
کمرے کی خاموش فضا میں در آیا ہے

ماضی کی ڈیوڑھی کی چلمن
کھُلے دریچے کی جالی سے
چھن چھن آئیں
روپ کی جوت حنا کی لالی کل کی یادیں
سوندھی خوشبو، ٹھنڈی بوندیں
کل کے باسی آنسو جن سے

فردا کے بالیں کا پردا بھیگ رہا ہے

سحر زدہ محبوس حسینہ
سپنوں کے شیلاٹ کی رانی
آئینوں میں "حسنِ شکستہ" دیکھ رہی ہے
کتنے چہرے ٹوٹے ٹوٹے
پہچانے ان پہچانے سے
آگے پیچھے آگے پیچھے بھاگ رہے ہیں
قلعے کے آسیب کی صورت
کس کی سسکی، کس کا نالہ
کمرے کی خاموش فضا میں در آیا ہے

بچھڑے لوگو، پیارے لوگو
چاہیں بھی تو نام تمہارے جان سکیں گے؟
کیسے مانیں تم کو ہمارے
جی لینے کی مر لینے کی
خوشی ہوئی افسوس ہوا
تم کیا جانو
کس کے ہاتھ کا تکیہ
کس کے گرم اشکوں سے بھیگ رہا ہے
کھُلے دریچے کی جالی سے چھنتی آنکھو!
اک لمحے کے کوندے میں تم
کن کن اجنبی چہروں کو پہچان سکو گی

جیون کھیل میں ہارے لوگو
بچھڑے لوگو، پیارے لوگو!
برکھا کی لمبی راتوں میں
گرمی کی خاموش فضا میں
پچھلے پہر کے سناٹے میں
روتے روتے جاگنے والے
ہم لوگوں کو سو لینے دو
اپنے آپ میں کھو لینے دو

نظم سنانے کے بعد ابن انشاء نے جیب سے رومال نکال کر اپنے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھا، اور عینک کے شیشے صاف کرنے لگا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ دن کافی گرم تھا اور ہوا بند تھی۔ املتاس کے زرد فانوس اپنی شاخوں پر ساکن تھے۔ دھوپ کی چمک سے درخت کی چھاؤں میں زرد غبار سا پھیلا تھا جس میں املتاس کے پھولوں کی گہری خوشبو رچی ہوئی تھی۔ خوشبو کا یہ زرد غبار شیشے کی طرح روشن تھا۔ جیسے درختوں کی شاخوں سے لٹکتے سارے زرد فانوس جگمگا اٹھے ہوں۔ مئی کا دن آہستہ آہستہ گرم ہو رہا تھا۔ دھوپ کی دھیمی دھیمی تپش اور پھولوں کی زرد زرد روشنی کا چمکتا گرم غبار مجھے ابن انشاء کی نظم کا ایک حصہ معلوم ہونے لگا تھا۔

"کہیں سے ٹھنڈا پانی پیا جائے۔" ابن انشاء نے کہا۔

ہم درختوں کی چھاؤں میں چلتے اوپن ایئر کیفے میں آ کر سائے میں بیٹھ گئے۔ ہم نے ٹھنڈا پانی پیا۔ پھر چائے آ گئی اور ہم خدا جانے کس موضوع پر باتیں کرنے لگے۔ کبھی ہنستے، کبھی مسکراتے ۔۔۔ ہمیں ہنستا مسکراتا دیکھ کر سنبل کے گھنے پیڑ پر سرخ پھولوں کے پاس بیٹھی ایک بلبل ہمیں گردن ٹیڑھی کر کے دیکھ رہی تھی۔ بلبلیں سنبل کے گھنے پیڑوں پر اب بھی بیٹھتی ہیں۔

لارنس باغ کی جنوبی گراؤنڈ میں املتاس کا درخت ویسے ہی کھڑا ہے۔ مئی جون کے دنوں میں اس کی ٹہنیوں پر زرد پھولوں کے چینی فانوس آج بھی کھلتے ہیں اور ہوا کے ہلکے سے جھونکے کے ساتھ جھولنے لگتے ہیں۔ اوپن ایئر کیفے میں چائے کی گرم گرم خوشبو آج بھی شام کی ہوا کے ساتھ اڑتی ہے اور املتاس کی چھاؤں میں روشن دھوپ میں زرد مہکتا غبار چمکتا ہے۔

لیکن وہ جیب سے کاغذ کا پرزہ نکال کر دھیمے لہجے میں نظمیں سنانے والا، رومال سے اپنی عینک کے شیشے صاف کرنے والا اور سنبل پر بیٹھی بلبل کو دیکھ کر خوش ہونے والا ابن انشاء نظر نہیں آتا۔ میں اکیلا لارنس باغ کی جنوبی گراؤنڈ کی طرف نہیں جاتا۔ املتاس کے زرد پھولوں نے مجھ سے پوچھا کہ ابن انشاء کہاں ہے تو میں کیا جواب دوں گا؟ میں پھر اوپن ایئر کیفے نہیں گیا۔ مجھے یقین ہے سنبل کی شاخ پر بیٹھی سرخ چونچ والی بلبل مجھ سے ضرور پوچھے گی کہ وہ شرما شرما کر نظمیں سنانے والا جو تمہارے ساتھ آیا کرتا تھا کہاں چلا گیا؟ تو پھر میں اسے کیا جواب دوں گا؟ ہمیں تو یقین آ گیا ہے کہ ابن انشاء ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے، لیکن شاید بلبل کو یقین نہ آئے۔ اور وہ بار بار مجھ سے پوچھتی رہے۔

وہ کہاں چلا گیا؟ وہ کہاں چلا گیا؟

"سویرا" رسالے کا دفتر میکلوڈ روڈ سے اٹھ کر لوہاری دروازے آ گیا۔ دفتر کے پیچھے ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں بیٹھ کر سعادت حسن منٹو آتش ترسے شغل کیا کرتے تھے۔ ایک روز منٹو صاحب کے ساتھ ظہیر کاشمیری بھی بیٹھے تھے۔ ظہیر کاشمیری نے کہا ٹھمری میں زیادہ اچھی گا تا ہوں۔ منٹو صاحب نے کہا۔

"اوئے تمہیں کیا معلوم ٹھمری کیا ہوتی ہے؟"

ابن انشاء نے کہا۔

"اس کا فیصلہ تو اسی طرح ہو سکتا ہے کہ آپ دونوں حضرات ایک ایک ٹھمری گائیں۔"

منٹو صاحب نے سنہری عینک کے پیچھے سے اپنی موٹی موٹی آنکھیں جھپکا کر کہا۔

"جو ٹھمری ظہیر کاشمیری گائے گا وہی میں گا کر سناؤں گا۔"

ظہیر کاشمیری نے ٹھمری گانی شروع کی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ٹھمری کے بول تھے ۔۔

سیّاں نے انگلی مروڑی رے
رام قسم میں سرما گئی۔

خدا جانے یہ ٹھمری حق کر کیا تھا۔ بہر حال ظہیر کاشمیری لہک لہک کر بس گائے جا رہا تھا۔ ابن انشاء نے کاغذ قلم لے لیا تھا اور اس پر کچھ لکھتا جا رہا تھا۔ منٹو صاحب آنکھیں لال کیے ظہیر کاشمیری کو دیکھ رہے تھے اور بار بار ناک سکیڑ کر ناپسندیدگی کا اظہار کر رہے تھے۔ ایک جگہ انہوں نے ہاتھ لہرا کر نعرہ لگایا۔

"یہ بے سُرا ہو رہا ہے۔"

ابن انشاء نے کہا۔

"میں نے نوٹ کر لیا۔ فکر نہ کریں۔"

ظہیر کاشمیری بیچ کر بولا۔

"میں نے ممتاز بیگم اور بھائی لال کو ٹھمری گاتے سُنا ہے۔ میں کیسے بے سُرا ہو سکتا ہوں؟"

ابن انشاء کہنے لگا۔

"بھئی آپ لوگوں نے مجھے جج مقرر کیا ہے تو فیصلہ بھی میرے اوپر چھوڑیں۔ ہاں منٹو صاحب۔ اب آپ کی باری ہے۔"

اب منٹو صاحب نے اپنی پتلی سی کمزور آواز میں وہی ٹھمری گانی شروع کی۔ وہ کلاونتوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر گا رہے تھے اور جب سم پر آتے تو زور سے اپنے گھٹنے پر ہاتھ مارتے۔ ایک بار انہوں نے بے خیالی سے ابن انشاء کے گھٹنے پر ہاتھ

مار دیا۔ ابن انشاء اچھل کر میرے قریب ہو گیا۔ ٹھمری ختم ہو گئی۔ منٹو صاحب اپنی سُرخ آنکھوں سے ابن انشاء کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"بتاؤ کون سُر میں تھا؟"

ابن انشاء نے اپنے لکھے ہوئے کاغذ کو گردن گھما پھرا کر دو تین بار غور سے پڑھا۔ پھر اُسے تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

"میں فیصلہ محفوظ رکھتا ہوں۔"

دونوں گویّے خالی بوتلیں اٹھا کر اس کی طرف لپکے۔ میں اور ابن انشاء دوسرے دروازے سے بھاگ کر گلی میں آ گئے۔ ہنس ہنس کر ہمارا بُرا حال ہو رہا تھا۔

میں مصری شاہ کے ایک محلے الہی پارک میں رہتا تھا۔ ہمارے مکان کے پچھواڑے انگور کی ایک بیل لگی تھی جس نے آدھے آنگن کو ڈھانپ رکھا تھا۔ سردیوں میں اس کے پتّے سوکھ کر جھڑ جاتے۔ بہار میں یہ بیل ہرے بھرے چمکیلے پتوں سے بھر جاتی اور پھر اس کی چھت میں سے سبز داخ کے گچھے لٹکتے دکھائی دیتے۔ ایک بار ابن انشاء نے انگور کے گچھوں کو دیکھ کر کہا۔

"اس بار انگور کے باغ کا ٹھیکہ مجھے دینا۔"

انگور پکتے تو میں ابن انشاء کو بُلا کر ضرور کھلایا کرتا۔ یہ کوئی اعلیٰ نسل کے انگور نہیں تھے۔ بس سبز رنگ کی کھٹی میٹھی داخ تھی۔ پھر بھی ہم اسے بڑے مزے لے لے کر کھایا کرتے اور پھر سبز چائے پیتے۔

ایک بار مجھے کہیں سے گیتا رائے کے بھجنوں کے کچھ ریکارڈ مل گئے۔ کیدار شرما کی فلم 'جوگن' کا اتوار والا شو ان دنوں لاہور میں بڑا رش لے رہا تھا اور پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر ہم لوگ میرا بائی کا یہ بھجن بہت گنگنایا کرتے تھے۔

جوگی مت جا مت جا
پاؤں پڑوں میں تیرے

میں نے ابن انشاء کو بتایا کہ میرے پاس گیتا رائے کے بھجن آئے ہیں۔ کسی روز گھر آؤ۔ تمہیں سناؤں گا۔

"ابھی چلتے ہیں۔"

ابن انشاء کو لے کر گھر آ گیا۔ انگور کی بیل ہرے بھرے پتوں سے بھری ہوئی تھی۔ ہم بیل کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ گراموفون پر گیتا رائے کا ریکارڈ چڑھا دیا۔ آپوجی باورچی خانے میں سبز چائے تیار کرنے لگیں۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ میں نے بیٹھک میں جمنا اگربتی سلگا دی تھی جس کی خوشبو آنگن میں بھی آ رہی تھی۔ بھجن شروع ہو گیا۔ یہ فلم جوگن کا ایک ایسا بھجن تھا جس کو ہم نے کبھی کسی ریڈیو اسٹیشن سے نہیں سنا تھا اور لاہور میں بھی اس کا ریکارڈ دستیاب نہیں تھا۔ شروع میں ستار کے ساتھ بنسری کا ایک ٹکڑا بجا اور پھر گیتا رائے کی آواز گونجی۔

گھٹ چلے اوؤ دُوت
نگری میں کوئی نہ براجے
پنچھی تھا سو پنچھو سدھارا
آسن پڑی ہے بھبھول
سنگی سہیلی کوئی نہ اپنا
سر پہ جم کا دُوت
میرا کے پربھو بندھن ٹوٹا
ٹوٹا کاچا سُوت

بھجن ختم ہو گیا۔ سبز چائے آ گئی۔ ابن انشاء کچھ دیر میرا بائی اور کبیر داس کی شاعری پر باتیں کرتا رہا۔ پھر بھگتی لہر پر گفتگو شروع ہو گئی۔ بات سرسید تک پہنچنے والی تھی کہ میں نے گراموفون کو چابی دیتے ہوئے کہا۔

"یار چھوڑو ان باتوں کو۔ تم گیتا رائے کو سنو۔"

"ہاں گیتا رائے کو ضرور سناؤ۔"

سبز چائے کا دُوسرا دور بھی چلا۔ ساتھ باقرخانیاں بھی تھیں۔ ابن انشاء کو ہمارے گھر کی سبز چائے بہت پسند تھی۔

"یار یہ چائے صرف امرتسری کشمیری بنانا جانتے ہیں۔"

محفل ختم ہوئی تو ہم مصری شاہ کی گلیوں سے نکل کر دہلی دروازے آ گئے۔ ابن انشاء کہنے لگا۔

"شہر کے اندر سے ہو کر پاک ٹی ہاؤس چلتے ہیں۔"

چنانچہ ہم دہلی دروازے میں داخل ہو کر سنہری مسجد کی طرف آ گئے۔ چوک وزیر خان کی ایک دکان سے ہم نے قیمے کا قتلمہ لیا اور وہیں کھڑے کھڑے کھانا شروع کر دیا۔ رنگ محل پہنچے تو بجائے شاہ عالمی کی طرف مڑنے کے ہم ہیرا منڈی کی جانب ہو گئے۔

"ارے تم مجھے خراب کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

ابن انشاء کی اس بات پر میں ہنس پڑا۔ پانی والے تالاب میں ایک عطائی دندان ساز کی دکان کے باہر لکھا تھا۔

"یہاں آرام کرسی پر بٹھا کر دانت نکالے جاتے ہیں۔"

ابن انشاء یہ تحریر پڑھ کر بڑا ہنسا۔ اُس نے دو تین فقرے چُست کئے جو مجھے اب یاد نہیں رہے۔ یہاں سے ہم گھاٹی اُتر کر میاں ایم اسلم کی حویلی کو دائیں جانب پیچھے چھوڑتے ہوئے ہیرا منڈی میں آ گئے۔ دن کے وقت بھلا یہاں کیا کوئی خراب ہو سکتا تھا۔ ابن انشاء محظوظ رہا اور ہم بھاٹی گیٹ کی طرف مڑ گئے۔ ابھی اونچی مسجد دُور تھی کہ بائیں جانب استاد امانت علی خان کا مکان آ گیا۔

میں نے کہا۔

"چلو امانت علی سے ملتے ہیں۔"

دو ایک مکانوں کے ملبے سے گزر کر ہم استاد امانت علی خان کے دروازے پر پہنچے۔ یہ مکان خستہ حالت میں تھا۔ بعد میں امانت علی خان یہاں سے اٹھ کر

قلعے کے پاس والے چار منزلہ پکے مکان میں آ گئے تھے۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ معلوم ہوا کہ امانت علی ابھی ابھی کہیں گئے ہیں۔ ہم بھاٹی گیٹ سے باہر نکل آئے۔ یہاں سے بائیں طرف باغوں باغ ہوتے ہوئے لوہاری دروازے پہنچے اور پھر انار کلی کی سیر کرتے پاک ٹی ہاؤس آ گئے۔ یہاں سبھی احباب حسب معمول جمع تھے اور دنیا جہاں کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ہم اس گفتگو میں شامل ہو گئے۔

ابن انشاء کراچی چلا گیا۔

اب وہ لاہور نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس کی ایک بڑی چھوٹی سی مگر بڑی گہری جذباتی وجہ تھی۔ دو ایک بار اُس نے مجھ سے اس جذباتی وجہ کا ذکر کیا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میں نے اس سے زبردستی ذکر کروایا تھا۔ ایسے معاملوں میں وہ بڑی شدید قسم کی رازداری سے کام لیتا تھا۔ بہرحال چونکہ یہ اُس کی خالصتاً ذاتی پسند اور ناپسند کا معاملہ تھا اس لیے میں سوائے خاموش رہنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اب اس جذباتی وجہ کو بیان کرنے کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ اس معاملے میں وہ ہر اُس راستے کو اختیار کرنے کا مجاز تھا جسے وہ اپنے لیے بہتر سمجھتا ہو، لیکن انسان اس دنیا میں جس راستے پر بھی چلے، آگے چل کر اس کے نتائج ضرور مرتب ہوتے ہیں۔

بہرحال کراچی جانے پر ابن انشاء خوش تھا اور میں اُسے ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ ان ہی دنوں میں دو ایک روز کے لیے کراچی گیا۔ مجھے اب اچھی طرح یاد نہیں۔ شاید وہ ریڈیو پاکستان کراچی کی عمارت تھی۔ ابن انشاء ایک بڑے سے کمرے میں بیٹھا خبروں کا ترجمہ کر رہا تھا۔ اسی نے میرا تعارف اپنے دو ایک بزرگ ساتھیوں سے کروایا جن کے اسمائے گرامی اب مجھے یاد نہیں رہے۔

شفیق صورتیں تھیں جو یادوں کی لوح پر دھندلا گئی ہیں۔ میں کراچی میں کسی دوسری جگہ پر ٹھہرا ہوا تھا۔ ابن انشاء کے ہاں نہ جا سکا۔

ابن انشاء کراچی سے جب بھی لاہور آتا مجھے ملنے میرے میوہ منڈی فلیمنگ روڈ والے مکان پر ضرور آتا۔ پھر ہم شہر کی پُراسرار گلیوں کی سیر کرتے، لارنس باغ میں اپنے پرانے ساتھی، املتاس کے زرد پھولوں والے درخت سے جا کر ملتے، اوپن ایئر کیفے یا لورینگز ریستوران میں بیٹھ کر چائے پیتے۔ خوب باتیں کرتے ایک دوسرے کو نئے نئے لطیفے سناتے۔ ہنستے ہنساتے۔

مرکز اُردو کراچی کے مالکان برادرِ عزیز خالد صاحب اور برادر محترم صلاح الدین صاحب میری دو کتابیں چھاپ رہے تھے۔ اس سلسلے میں مجھے کراچی جانا پڑا تو میں ابن انشاء کے پاس جا کر ٹھہرا۔ ابن انشاء جہانگیر روڈ پر رہتا تھا۔ اسی پتے پر میں اُسے خط بھی لکھا کرتا تھا۔ ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ جہاں اس کے نام کی تختی لگی تھی۔ سامنے والے کمرے میں کھڑکی کے ساتھ لوہے کا ایک پلنگ بچھا تھا۔ صوفے پر رسالے پڑے تھے۔ کونے میں تپائی پر بھی کتابیں ڈھیر تھیں۔ الماری بھی کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر ابن انشاء بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"تم کسی غلط گھر تو نہیں آ گئے؟"

میں نے کہا۔

"مجھے اس گھر سے املتاس کے زرد پھولوں کی خوشبو آ رہی ہے۔"

ہم گلے ملے۔ میں نے شیو بنائی۔ غسل کیا۔ کپڑے تبدیل کئے۔ کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ ابن انشاء بڑی محبت سے مجھے ہر ایک ڈش میں سے سالن نکال نکال کر دے رہا تھا۔ پھر خالص دیسی گھی میں ملی ہوئی شکر آ گئی۔ یہ ابن انشاء کے گھر کی خاص ڈش تھی جو مجھے بڑی پسند تھی۔ جیسا دیسی گھی میں نے ابن انشاء کے گھر دیکھا ویسا پھر بہت کم نظر آیا۔ آپس میں ہنسی مذاق کرتے لاہور کی باتیں کرتے کھانا ختم کیا۔ چائے پی اور میں اردو مرکز کی طرف چل نکلا۔

دوسرے روز میں اور ابن انشاء اکٹھے گھر سے نکلے، کراچی کے احباب سے ملاقات کی۔ ہر طرف محبت، گرم جوشی اور اخلاص کی فضا تھی۔ مسعود تابش نے کمال محبت سے دعوت کا اہتمام کر کے میری عزت افزائی کی۔ اُن کے ہاں جو لذیذ کوفتے کھائے ان کی خوشبو دار یاد ہمیشہ میرے ساتھ رہے گی۔ ابوالخیر کشفی کے ساتھ محفل لگی۔ شاہد احمد دہلوی کے نیاز حاصل کرنے ریڈیو سٹیشن گیا۔ بڑی شفقت سے ملے اور فرمایا۔

"میاں آج رات کا کھانا ہمارے ہاں کھائیے گا۔"

یہ میرے لیے بڑا اعزاز تھا۔ میں شاہد صاحب کا مداح تھا۔ "ساقی" وہ برابر کمال مہربانی سے مجھے بھیجا کرتے تھے اور میں بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔

شام گہری ہوئی تو میں ابن انشاء کے ساتھ جہانگیر روڈ والے مکان سے چل پڑا۔ سڑک پر آ کر شاید رکشا لیا یا پیدل ہی روانہ ہو گئے، کیونکہ مجھے یاد ہے، ابن انشاء نے کہا تھا کہ شاہد صاحب کا مکان زیادہ دُور نہیں ہے۔ شاہد صاحب نے بڑا اہتمام کر رکھا تھا۔ محمد حسن عسکری صاحب، زبیری صاحب اور جمیل جالبی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ ایسے ایسے استادانِ فن کے آگے بھلا میں کیا بات کرتا۔ بس برما اور سیلون کے درختوں کی باتیں کرتا رہا۔ عالمانہ گفتگو شروع ہوتی تو ابن انشاء کو آگے کر دیتا۔ ابن انشاء ہر نوع کے علمی ادبی موضوع پر بڑی فاضلانہ گفتگو کر لیتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا مطالعہ بڑا وسیع تھا اور پھر اُسے بات کرنے کا سلیقہ بھی آتا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ موقع محل کے مطابق فقرے بھی چست کرتا جاتا تھا۔ ان ہی دنوں کراچی کے ایک رسالے "ادب" میں میرا ایک مزاحیہ مضمون "رقیب کے ایک خط" چھپا تھا۔ ابن انشاء کو یہ مضمون بہت پسند تھا۔ اُس نے میرے اس مضمون کی بات شروع کر دی اور میں اس محفل میں عالمانہ موضوع پر احمقانہ باتیں کرنے سے بچ گیا۔

کھانا بے حد پُر تکلف تھا۔ جب میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا تو دلی میں ایک بار خواجہ حسن نظامی کے دسترخوان پر بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ شاہد صاحب کی دعوت میں اس یادگار محفل کی یاد تازہ ہو گئی۔ دہلی کے خاص خاص پکوان پکے تھے۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ انجمن ترقی اردو اور مولوی عنایت اللہ صاحب کے عیر فانی تراجم کی بات شروع ہو گئی۔ میں نے بڑی حسرت سے فلابیر کے ناول "سلامبو" کا ذکر کیا۔ جسے مولوی عنایت اللہ نے ترجمہ کیا تھا اور جو مجھ سے گم ہو گیا تھا۔

شاہد احمد صاحب نے کمال مروت سے کہا۔

"میاں اس کتاب کی دو آخری جلدیں میرے پاس رکھی پڑی ہیں۔ بے شک تم لے جاؤ۔"

انہوں نے "سلامبو" کے دونوں حصے مجھے مرحمت فرما دیے جو آج بھی میرے پاس ایک قیمتی یادگار کی طرح محفوظ ہیں۔ رات گہری ہو گئی تھی کہ ہم شاہد احمد صاحب کے گھر سے واپس ہوئے۔ بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔

ہم پیدل ہی جہانگیر روڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابن انشاء کہنے لگا۔

"تم نے شاہد صاحب سے کتابیں تو مار لی ہیں اب ایسا کرو پڑھ کر انہیں میرے پاس ہی چھوڑ جاؤ۔ لاہور میں تم سے ادھر اُدھر ہو جائیں گی۔"

میں نے کہا۔

"پیارے تمہیں تو میں ان کی ہوا بھی نہ لگنے دوں گا۔"

کہنے لگا۔

"اچھا چلو پہلا حصہ مجھے دیتے جاؤ۔ پڑھ کر دوسرا حصہ بے شک بعد میں بھجوا دینا۔"

میں نے سڑک پر ہی اُسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ ہنستا بھی جاتا تھا اور کہے بھی جاتا تھا۔

"ارے کمینے کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔"

میں نے کہا۔

"پہلے وعدہ کرو کہ تم مجھ سے کتاب نہیں مانگو گے۔"

ابن انشاء اپنی عینک سنبھالتے ہوئے بولا۔

"اچھا بابا وعدہ کرتا ہوں۔ جہاں تمہارے پاس پہلے میری اتنی کتابیں ہیں وہاں یہ بھی سہی۔"

"ارے پہلے کونسی کتاب دی ہے تو نے مجھے۔"

میں نے اُسے چھوڑتے ہوئے پوچھا۔ کہنے لگا۔

"یاد نہیں وہ کتاب۔ ورلڈز فیمس بکس ان آؤٹ لائن؟"

"ارے ہاں یاد آیا۔ مگر وہ تو ایک کتاب ہے۔"

"اس ایک کتاب میں اکٹھی پچاس کتابوں کا خلاصہ دیا ہوا ہے۔ اس اعتبار سے تمہارے پاس میری پچاس کتابیں ہیں۔"

یہ انگریزی کتاب میں نے لاہور میں زبردستی ابن انشاء سے چھین لی تھی۔ اس کتاب کے پہلے صفحے پر اندر کونے میں ابن انشاء نے اپنے ہاتھ سے انگریزی میں لکھا ہے۔

S.M. Qaisar

6. NOV. 1946

درمیان میں اُس نے اردو میں "ابن انشاء" لکھا ہے۔ نیچے ایک مہر لگی ہے جہاں لکھا ہے۔

"دی انگلش بک ڈپو

انبالہ اینڈ کسولی"

یہ کتاب اس وقت بھی میرے سامنے شیلف میں رکھی ہے اور مجھے میرے دوست کی یاد دلا رہی ہے۔

ہم ٹکراتے ہنستے لطیفہ گوئی کرتے جہانگیر روڈ والے مکان پر آ گئے۔ کچھ دیر دیوان خانے

میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ پھر میں اُسی کمرے کے پلنگ پر سو گیا۔ صبح ناشتے کے بعد ہم برآمدے میں بیٹھے تھے کہ ایک فقیر سارنگی بجاتا ہوا سامنے سے گزرا۔ میں نے ابنِ انشاء سے کہا۔

"کیا تم اپنے مہمان کو سارنگی نہیں سنواؤ گے؟ خلیفہ ہارون الرشید کے بغداد میں تو میزبان اپنے مہمانوں کو وہ برتن بھی دے دیا کرتے تھے جن میں انہیں کھانا کھلایا جاتا تھا۔"

ابنِ انشاء نے کہا۔

"ایسا وہ لوگ متعدی امراض سے بچنے کے لیے کیا کرتے تھے۔ بہر حال اگر تمہیں ناشتے کے بعد بھی موسیقی کی طلب محسوس ہو رہی ہے تو فقیر کو بلا کر سارنگی سُن سکتے ہو۔"

میں نے فقیر کو آواز دے کر بلا لیا اور اُسے سارنگی سنانے کو کہا۔ فقیر نے دھڑا دھڑ گز چلانا شروع کر دیا۔ جب وہ تھک گیا تو رُک گیا اور میری طرف داد طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے ابنِ انشاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس گھر کے مالک یہ صاحب ہیں۔ ان سے مانگو جو لینا ہے۔"

ابنِ انشاء نے اپنی اکلوتی گالی دیتے ہوئے کہا۔

"حرامزادے! سارنگی تم نے سُنی ہے۔ میں اسے پیسے کیوں دوں؟"

"لیکن تم بھی تو میرے ساتھ ہی سُن رہے تھے۔"

"سُن کہاں رہا تھا مجھے تو اس کی آواز آ رہی تھی۔"

"تو چلو اس کی آواز کے ہی دو روپے دے دو۔"

بڑی مشکل سے ابنِ انشاء نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر کہا۔

"لو بابا! آٹھ آنے واپس دینے کی ضرورت نہیں۔"

میں اٹھ کر ابنِ انشاء سے لپٹ گیا۔ زبردستی اس کی جیب سے مزید ایک روپیہ نکال کر فقیر کو دے دیا اور کہا۔

"بابا! تم روز صبح آ کر صاحب کو سارنگی سنا جایا کرو اور دو روپے لے جایا کرو۔"

ابنِ انشاء نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کل یہ آئے گا تو میں پہلے ہی سارنگی بجا رہا ہوں گا۔"

میں نے کہا۔

"تم ایسا کرنا۔ اس فقیر کو اپنی نظمیں سنانی شروع کر دینا۔ خدا کی قسم پھر کبھی یہ ادھر کا رُخ نہیں کرے گا۔"

کتنی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں، لیکن ہم کس قدر خوش ہوا کرتے تھے۔ کس قدر ہنسا کرتے تھے۔ شاید زندگی کی سب سے عظیم خوشیاں زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہی پوشیدہ ہوتی ہیں۔ ہنستے ہنستے ہمارے پیٹ میں بل پڑ جاتے اور بات محض اتنی ہوتی تھی کہ ہم نے سڑک پر سے گزرتے کسی ایسے شخص کو دیکھ لیا جو بطخ کی طرح چل رہا تھا۔ کسی لڑکے کو سکول کی دیوار پر بیٹھا دیکھتے تو ابنِ انشاء اشارہ کرتا۔

"ارے! وہ دیکھو گورکی کا ٹُنکا بیٹھا ہے۔"

اور ہم دُور تک ہنستے چلے جاتے۔

ہم گھر سے اکٹھے نکلے۔ ابنِ انشاء کو اُس کے دفتر چھوڑ کر میں اردو مرکز آ گیا۔ دوپہر کا کھانا میں نے برادرِ محترم صلاح الدین کے ساتھ کھایا۔ تیسرے پہر میں نے ابنِ انشاء کو دفتر سے لیا اور ہم کافی ہاؤس آ گئے۔ یہاں کئی ایک دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ یہاں سے اٹھے۔ نیچے سڑک پر آئے تو میں نے سمندر سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ابنِ انشاء بولا۔

"لاہور سے جو ادیب شاعر آتا ہے سمندر کی طرف چل پڑتا ہے۔ ارے وہاں کیا رکھا ہے۔"

"نہیں یار سمندر دیکھنے چلتے ہیں۔"

ہم کلفٹن پر آ گئے۔ کراچی کا سورج سمندر کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ دُور دُور سے بڑی بڑی لہریں چلی آ رہی تھیں۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ ہم نمکین چنے کھاتے سمندر کے ساتھ ساتھ ریت پر سیر کرنے لگے۔ سمندر کے بارے میں ابن انشاء زیادہ جذباتی نہیں تھا۔ ہاں اگر سمندر کی لہروں سے زرد چاند طلوع ہو رہا ہو تو وہ سحر زدہ ہو کر اُسے دیکھا کرتا۔ یہاں بھی وہی چاند اُسے ہانٹ کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ چاند شروع دن سے اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ یا ابن انشاء روز اول سے چاند کے تعاقب میں تھا۔ کراچی کے سمندر کا ساحل میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ویران ویران۔ درختوں کے بغیر۔ مجھے یہ ساحل پسند نہ آیا۔ میں نے جنوب مشرقی ایشیا کے سمندروں کے ساحل دیکھے تھے۔ جہاں ناریل کے جھنڈ صبح کی ہوا میں جھومتے ہیں۔ اور تیز بارشوں میں ہوائیں ناریل کی مہک لے کر ساحلوں پر چلتی ہیں۔ یہاں ناریل کا ایک بھی درخت نہیں تھا۔ کوئی ملائی، برمی یا سنہالی لڑکی زرد کیلوں کا گچھا اٹھائے تاڑ کے درختوں میں اپنی جھونپڑی کو جاتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ریت پر سیپیاں اور گھونگھے جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے۔ ہم دونوں سیپیاں اکٹھی کرنے لگے۔ میں نے کہا۔

"کراچی کا سمندر بڑا خوبصورت ہے۔ اس کا رنگ زمرد کا رنگ ہے۔ لیکن ساحل پر ایک بھی درخت نہیں"

ابن انشاء نے کہا۔

"کچھ تصور سے بھی کام لینا چاہیے تمہیں۔ ویسے یار ایڈ گر ایلن پو نے اپنی نظم میں ایک جزیرے کا ذکر کیا ہے جس کے ساحل پر چوڑے چوڑے پتوں والے بڑے ہی گنجان درخت ہیں۔ میں کبھی نہ کبھی اس جزیرے میں ضرور جاؤں گا۔ کیا خیال ہے؟"

"اگر وہ جزیرہ آدم خوروں کا جزیرہ نکلا تو پھر کیا کرو گے؟"

ابن انشاء نے ہنس کر کہا۔

"اس سے مجھے ایک کارٹون یاد آ گیا۔ دو آدم خوروں نے ایک انگریز کو تیل کے کڑاہے میں ڈال رکھا ہے۔ ایک آدم خور کڑاہے کے نیچے خشک لکڑیاں لگا رہا ہے اور دوسرا آدم خور اُس انگریز سے پوچھ رہا ہے۔ تمہارے پاس ماچس ہو گی؟"

اس کارٹون پر ہم دونوں بہت ہنسے۔ اس سے مجھے یاد آیا کہ ہم لاہور میں انگریزی فلموں کے ساتھ دکھائے جانے والے کارٹون بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ یہ کارٹون فلم کے شروع میں دکھائے جاتے چنانچہ ہم فلم شروع ہونے سے بہت پہلے سینما ہال میں جا کر بیٹھ جاتے تھے۔ اس خیال سے کہ کارٹون پورا دیکھیں۔ اُن دنوں لاہور کے سینماؤں میں والٹ ڈزنی اور ڈیوڈ ہینڈ کے بڑے ہی کلاسیکی قسم کے کارٹون دکھائے جاتے تھے۔ جنہیں دیکھ کر ہمارا ہنس ہنس کر بُرا حال ہو جاتا تھا۔ یا پھر ہم کچھ زیادہ ہی ہنسا کرتے تھے۔ عام طور پر ایسا ہوتا کہ سینما ہال میں لوگ خاموش رہتے اور ہمارے ایکدم سے قہقہے بلند ہوتے۔ کسی خرگوش کو آنکھ مار کر گاجر کھاتے دیکھ کر یا کسی چوہے کو سنبھل سنبھل کر بلی کے پیچھے سے گزرتا دیکھ کر ہم اپنی ہنسی ضبط نہیں کر سکتے تھے۔

باتیں کرتے، ہنستے مسکراتے، سیپیاں اکٹھی کرتے ہم ساحل سمندر پر کافی دور تک نکل گئے۔ ایک جگہ بنچ پر بیٹھ کر ہم نے چائے پی اور پھر واپس ہوئے۔

اسلامیہ کالج کے طلبا اور اساتذہ نے مجھے یہ اعزاز بخشا کہ مجھے اپنے کالج میں بلایا۔ میرے فن کے بارے میں کچھ اصحاب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ابن انشاء نے اپنی تعارفی تقریر میں حاضرین کو بڑے دلچسپ انداز میں میرے بارے میں بتایا۔ مجھے اس کے جملے یاد نہیں رہے۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ تقریر کرتے ہوئے وہ خود بھی ہنس رہا تھا اور طالب علم بھی محظوظ ہو رہے تھے۔ البتہ میں ضرور اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تقریب کے بعد گھر آ کر میں نے اُسے پکڑ لیا۔

"اب بتا۔ وہاں کیا کہہ رہا تھا؟"

ابن انشاء آگے آگے تھا اور میں پیچھے پیچھے ــــ وہ بار بار میکسم گورکی کے کردار پچرکا کی زبان میں یہی دہرائے جاتا تھا۔

"ارے منکا! یہ تو تیری گپ ہے۔"

"ارے پچرکا! مجھے کیا ضرورت تھی ایسی باتیں کہنے کی؟"

ابن انشاء نے بے اختیار کہا۔

"حالات اور فسادات . . . . ."

اور ہم دونوں کھل کھلا کے ہنس پڑے۔ اصل میں "حالات اور فسادات" لاہور کے ایک مشہور و معروف ناشر کا تکیہ کلام تھا۔ پاکستان کو بنے بس کوئی دو ایک سال ہوئے تھے۔ کتاب اگر وقت پر نہ چھپ سکتی تو کہتے۔

"کیا کروں۔ بس حالات اور فسادات . . . . ."

ایک بار میں اور ابن انشاء نے پروگرام بنایا کہ لورینگز میں بیٹھ کر بہترین فروٹ کیک اڑاتے ہیں اور چائے کے ساتھ اعلیٰ خاندانی سگریٹوں کا لطف اٹھاتے ہیں۔ اس نے اپنے موٹے شیشوں والی عینک کے پیچھے سے گھورتے ہوئے کہا۔

"بل کون ادا کرے گا؟"

میں نے اسے بتایا کہ اس مشہور و معروف پبلشر کے پاس چلتے ہیں۔ ان کی طرف میری کتاب کے کچھ پیسے نکلتے ہیں۔ انہیں وصول کر کے لورینگز کا بل ادا کر دیں گے۔ ابن انشاء نے چہک کر کہا۔

"سکیم تو مجھے پسند آئی ہے لیکن ذرا حالات اور فسادات کا بھی خیال رکھنا ہو گا۔"

"تم فکر نہ کرو۔ آؤ میرے ساتھ۔"

ہم دونوں ناشر صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ اس زمانے کے ناشروں سے پیسوں کا تقاضا کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ ویسے اس کام کے لیے آج بھی بڑا دل گردہ

چاہیئے۔ بہرحال ہم علیک سلیک کے بعد بیٹھ گئے۔ ناشر صاحب کوئی خط لکھ رہے تھے۔ بڑی خندہ پیشانی سے ملے۔ اس کے بعد وہ ہمیں بھول گئے۔ ابن انشاء مجھے پاؤں سے ٹھوکے دینے لگا کہ پیسے مانگو۔ میں اس ڈر سے پیسے نہیں مانگ رہا تھا کہ کہیں وہ انکار نہ کر دیں۔ ایک بار ناصر کاظمی نے مجھے کہا تھا۔

"پیارے! پبلشر سے پیسے وصول کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ جاتے ہی کہہ دو۔ جناب میرے پیسے عنایت کر دیجیے۔"

ناصر کاظمی کا خیال درست تھا کیونکہ اگر پیسے نہ بھی ملیں تو کم از کم آدمی اس بھیانک کوفت سے بچ جاتا ہے جو پیسے نہ مانگ کر وہاں دو گھنٹے بیٹھنے سے ہوتی ہے۔

"پیارے! اگر تم نے جاتے ہی پبلشر پر حملہ نہیں کیا اور اسے کچھ وقت دے دیا تو پھر تمہاری سپاہ تتر بتر ہو جائے گی اور تم بے نیل و مرام واپس آ جاؤ گے۔"

میرے ذہن میں ناصر کاظمی کے جملے گونج رہے تھے اور میری سپاہ تتر بتر ہونے لگی تھی۔ تیسری بار جب ابن انشاء نے مجھے زور کا ٹھوکا دیا تو میں تقاضا کر بیٹھا۔ ناشر صاحب بدستور خط لکھنے میں منہمک تھے۔ انہوں نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ میں دوسری بار حملہ کرنے والا تھا کہ وہ خط لکھتے لکھتے مسکرائے۔ آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ چہرہ یکلخت اداس ہو گیا۔ ایک گہرا سانس لیا اور بولے۔

"کیا عرض کروں۔ کچھ حالات اور فسادات . . . . . ."

قصہ مختصر انہوں نے بڑی مشکل سے میز کی دراز کھولی۔ اس میں سے دس دس روپے کے دو نوٹ نکال کر میز پر ہمارے سامنے رکھے۔ انگلی سے ایک نوٹ میری طرف بڑھایا اور دوسرا نوٹ اسی انگلی سے اپنی طرف کھسکا لیا۔

"دس روپے آپ لے لیں۔ دس روپے میرے پاس رہنے دیں۔ اگر حالات اور فسادات اجازت دیتے تو . . . . . ."

کراچی کی ایک لڑکی مجھے بہت خط لکھا کرتی تھی۔ میں رسمی طور پر اسے جواب

دے دیا کرتا تھا۔ میں اس کا اصلی نام نہیں لکھوں گا۔ آپ اسے عزالہ کہہ لیجیے۔ ابن انشاء کو معلوم تھا۔ ایک روز شام کے وقت ہم دونوں غالباً کراچی کے شیزان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ میں نے کہا۔

"یار عزالہ سے چل کر ملا جائے۔"

ابن انشاء نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یاد رکھ۔ تیرے سارے کرتوت میں ریحانہ کو لکھ بھیجوں گا۔"

میں نے کہا۔

"میں صرف اُس لڑکی سے ملنا چاہتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ میرا دل صاف ہے۔ کم از کم لڑکیوں کے بارے میں۔"

ابن انشاء نے مجھے بہتیرا دھمکایا لیکن میں اُسے لے کر عزالہ کے گھر کی طرف چل پڑا۔ ایک بنی کلاتہ سٹائیل کی عمارت تھی جس میں کئی ایک پرانے فلیٹ تھے۔ ایک سیڑھی اوپر فلیٹوں کو جاتی تھی۔ نمبر مجھے یاد تھا۔ ہم دونوں ایک فلیٹ کے دروازے پر جا کر کھڑے ہو گئے۔

"سالے کہیں مروا نہ دینا۔"

"فکر نہ کرو۔"

میں نے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک چھوٹے لڑکے نے دروازہ کھولا۔ میں نے کہا۔

"عزالہ بی بی ہیں؟"

لڑکا دروازہ بند کر کے بھاگ گیا۔ ابن انشاء نے کہا۔

"ابھی وقت ہے بھاگ چلو۔"

اتنے میں اندر سے ایک نسوانی آواز آئی۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

میں نے اپنا نام بتایا تو ایک لمحے کے لیے اندر سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا

پھر وہی لڑکا دروازہ کھول کر بولا۔

"آ جائیں۔"

چھوٹا سا کمرہ تھا۔ پلنگ۔ بید کی دو تین کرسیاں۔ کیلنڈر۔ کارنس پر گھر۔ دو تصویریں۔ تپائی پر اونٹ کی کھال والا ٹیبل لیمپ۔ بیچ میں ایک گول میز۔ کمرے کی فضا میں لکس صابن کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ دوسرے کمرے کے غسل خانے سے بالٹی میں پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ پانی کی آواز بند ہو گئی۔ بید کی کرسیوں پر گرد کی ہلکی ہلکی تہہ جمی تھی۔ ہم نے رومال نکال کر گرد صاف کی اور بیٹھ گئے۔ ابن انشاء نے مجھے اپنی مخصوص الگوتی کا لی دے کر کہا۔

"اگر اُس کا باوا آ گیا تو کیا کہو گے؟"

میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو"

کہنے لگا۔

"سالے یہ لاہور نہیں کراچی ہے۔ تم تو چلے جاؤ گے۔ میں پیچھے لوگوں کو کیا جواب دیتا پھروں گا؟"

"فکر نہ کرو۔"

اور میں نے گولڈ فلیک کی گولڈن ڈبی کھول کر نہایت خوبصورت سگریٹ سلگا لیا۔ دروازے کا نیلا پردہ ہٹا۔ وہی لڑکا چائے کا ٹرے میز پر رکھ کر چلا گیا۔ دو پیالیاں چائے سے بھری تھیں اور ایک نیلی طشتری میں خشک میوہ تھا۔ سبز رنگ کے لمبے خشک انگور دیکھ کر میں نے ابن انشاء سے کہا۔

"مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میں بغداد کے کسی خانہ بدوش سردار کا مہمان ہوں۔ یہ خشک میوہ۔ یہ چائے کی فنجان۔"

ابن انشاء نے ناک پر عینک ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی خشک میوے کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ ذرا اس خانہ بدوش

سردار کو کمرے میں آ لینے دو۔"

میں نے اُسے آنکھ مار کر کہا۔

"فکر نہ کرو۔"

چائے تلخ تھی اور اس میں دار چینی کی ہلکی ہلکی مہک بھی تھی۔ اس مہک نے گولڈ فلیک کے فلیور سے مل کر ایک نئی خوشبو کو جنم دیا۔ یہ گرم حِنائی خوشبو جیسے سُرخ ریشمی دلہن بن کر میرے سامنے سے گزر گئی۔ پھر اس خوشبو نے گرم صحرا کی شام میں مجھے دُور سے دیکھا اور اسکی آنکھیں سُرخ یاقوت بن کر چمک رہی تھیں اور ان آنکھوں میں جیسے دو سورج غروب ہو رہے تھے۔ یہ ایک سحر تھا۔ ایک طلسم تھا جو مجھے ابن انشاء کے موصل و بغداد کی خواب آلود گلیوں میں لے گیا۔ مجھے ایڈگر ایلن پو کی نظم ایلڈوریڈو یاد آ گئی۔ یہ نظم مجھے ابن انشاء نے مارچ ۱۹۵۵ء کی شام کو 'لورینگز' میں سنائی تھی۔ یہ خوبصورت شام مجھے کبھی یاد نہ رہتی اگر اس روز مجھے ریحانہ کی سالگرہ کا کارڈ نہ ملتا۔ میں بہت خوش تھا۔ اور یہ کارڈ لے کر ابن انشاء کے گھر گیا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ آج ریحانہ کی سالگرہ ہے اور اُس نے مجھے کارڈ بھیجا ہے۔ پھر ہم 'لورینگز' میں آ گئے۔ ابن انشاء میرے رومانس سے بہت خوش تھا کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ میں ریحانہ سے شادی کرنے والا ہوں۔ کیسی شفاف، چمکیلی اور خوشبودار تھی چائے جو ہم نے اُس شام 'لورینگز' میں بیٹھ کر پی۔ تانبے کے گلدان میں یوکلپٹس کی ٹہنیاں سجی تھیں۔ سالگرہ کا سنہری کارڈ بے داغ میز پر گولڈ فلیک کے گولڈن پیکٹ کے پاس پڑا تھا۔ اور ابن انشاء مجھ سے ایلڈوریڈو نظم کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ ایلڈوریڈو ایک شہر ہے۔ خوابوں کا شہر۔ ایک خوبرو نائٹ گھوڑے پر سوار اس شہر کی تلاش میں گھر سے نکلتا ہے۔ جنگل جنگل، قریہ قریہ، وادی وادی پھرتا ہے۔ جوانی سے بڑھاپا آ جاتا ہے، لیکن خوابوں کا شہر سوار کو دکھائی نہیں دیتا۔ پھر ایک جنگل میں اُسے ایک بچھڑا ملتا ہے جو اسے بتاتا ہے کہ خوابوں کا شہر ایلڈوریڈو ——— چاند کی پہاڑیوں سے اُدھر سایوں کی وادی میں ہے۔ اور نائٹ کا گھوڑا آگے بڑھتا ہے۔

اور پھر آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے ——— ایک گھوڑے پر سوار ابن انشاء خوابوں کے ایلڈوریڈو کی تلاش میں سفر کر رہا تھا اور ایک گھوڑے پر سوار میں بھی خوابوں کے ایلڈوریڈو کی کھوج میں تھا۔ ریحانہ کی سالگرہ کا کارڈ آج بھی میرے پاس ہے، یہی وجہ ہے کہ مجھے وہ شام یاد رہی جب شام 'لورینگز' میں بیٹھ کر مجھے انشاء نے ایلڈوریڈو نظم سنائی تھی۔

میں اس نظم کا ہیرو بنا، سفید گھوڑے پر سوار، نیزہ تانے، وادی میں آندھی بن کر اڑا جا رہا تھا کہ دروازے کا نیلا پردہ ایک بار پھر ہٹا اور سب سے پہلے فارول سینٹ کی خوشبو اندر آئی اور اس کے بعد تیز چمکیلی آنکھوں اور شفاف چاندنی ایسے چہرے والی لڑکی اندر آئی اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ کمرے میں فارول کی خوشبو پھیل گئی۔ یہ عزرا تھی۔ کم سخن۔ کم آمیز۔ کسی وقت نظریں اٹھا کر دیکھتی اور پھر نظریں جھکا لیتی۔ اس نے ایک بار پھر چائے بنا کر دی۔ ایک بار مجید امجد نے پنجابی کا ایک شعر سنایا تھا۔ یہ شعر ساہیوال کے ایک دیہاتی شاعر نے اپنی محبوبہ کے حُسن کی تعریف میں کہا تھا۔

واہ مکھڑا جیہدا باندی دا
جیویں چن چڑھ پیندا چاندی دا

عزرا بھی چاندی کا چاند تھا جس کے چہرے سے شفاف کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ اور سارا کمرہ روشن ہو گیا تھا۔ اس روشنی نے مجھے بھی روشن کر دیا تھا۔ اس کی نگاہوں میں حیا اور پاکیزگی تھی۔ وہ اُدھے پورے کراچی میں آئے تھے ——— اودھے پور ——— نیلی جھیل میں جھلملاتے ستاروں کا عکس۔ اور راج محل کے دروازے سے نکل کر آدھی رات کی خاموشی میں جنگل کی طرف، صحرا کی طرف جاتی میرا بائی۔

ہے ری میں تو پریم دیوانی

سبز انگوروں کے زمرّد، اودھے پور کی جھیلوں پر تیرتے سفید کنول اور صحرائی راتوں میں گونجتے میرا بائی کے گیت۔ اور ہرے بھرے باغوں میں کھلا ہوا سفید موتیا۔

گولڈفلیک کا فلیور اور چائے کی سلگتی مہک ۔۔ ہم غزالہ کے گھر سے نکل کر سڑک پر آئے تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم ایک شہر سے مل کر آ رہے ہیں۔ تاریخ کے اوراق میں سویا ہوا، اندھیروں کی وادیوں میں کھویا ہوا شہر ـــــ جس کے ویران مکانوں کی منڈیروں پر آ کر چاند رُک گیا ہے۔

میں نے ابن انشاء کو مجید امجد کا سنایا ہوا پنجابی کا شعر سنایا تو کہنے لگا۔

"چاند گاؤں میں بھی سفر کرتا ہے۔"

چاند کراچی کی سڑکوں پر بھی اُس رات ہمارے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا۔ جہانگیر روڈ والے مکان پر آ کر ہم دیر تک غزالہ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اس تیز چمکیلی آنکھوں اور شفاف چاندی ایسے چہرے والی لڑکی نے مجھے خوشبو اور پاکیزگی کا احساس دیا تھا۔ رات کو مجھے اپنے بستر پر بڑی گہری خوشبو آئی جیسے موتیے کا سفید پھول سانس لیتا میرے قریب سے گزر گیا ہو۔ ایک جُگ بیت گیا ہے اس بات کو۔ اودھے پور کی میرا بائی سے پھر ملاقات نہ ہو سکی۔ نیلی جھیل میں کھلے اس دودھیا کنول کے پھر درشن نہ ہوئے۔ آج بھی جب کبھی اس کا خیال آتا ہے تو موتیے کے گجرے کی دھیمی دھیمی سی مہک آتی ہے جو کسی دلہن کی کلائی سے پھسل کر فرش پر گر پڑا ہو۔

کچھ روز کراچی میں ٹھہرنے کے بعد میں لاہور کی طرف روانہ ہوا۔

لاہور بہت یاد آنے لگا تھا۔ ابن انشاء ریلوے سٹیشن تک میرے ساتھ آیا۔ اس کا ایک ترجمہ کیا ہوا مسودہ لاہور میں کسی پبلشر کو دینا تھا۔ وہ مجھے بار بار تاکید کر رہا تھا۔

"تم لاابالی اور غیر ذمے دار آدمی ہو۔ مسودے کو سنبھال کرلے جانا اور جاتے ہی پبلشر کے حوالے کر دینا۔"

انجن نے سیٹی بجائی۔ ان دنوں سیٹی والے ریلوے انجن چلا کرتے تھے۔ بڑا شور مچاتے۔ بڑا دھواں چھوڑتے۔ بڑی راکھ اڑاتے۔ کراچی سے لاہور

اور لاہور سے کراچی پہنچنے والا مسافر بہت تھک جاتا تھا۔ ریل گاڑی چل پڑی، ابن انشاء پلیٹ فارم پر کھڑا ہاتھ ہلاتا رہا۔ میں ڈبے کے دروازے میں کھڑا اُسے دیکھتا رہا اور ہاتھ ہلاتا رہا۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میری شادی پر ابن انشاء نہ آ سکا۔ وہ ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس کی جہاں گردی شروع ہو چکی تھی۔ وطن واپس آیا تو مجھے کراچی سے مبارکباد کا خط لکھا۔ کچھ دنوں بعد اس کا لاہور آنا ہوا تو میرے فلیمنگ روڈ والے مکان پر آیا۔ وہاں تالا لگا تھا۔ معلوم ہوا کہ میں اپنے سسرال موچی دروازہ گیا ہوا ہوں۔ سیدھا موچی دروازے والے مکان پر آ گیا۔ مجھ سے بغلگیر ہو کر ملا اور شرارت بھری آنکھوں سے مسکراتا ہوا بولا۔

"کمینے! آخر تو نے بے چاری بھولی بھالی ریحانہ کو پھانس ہی لیا۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا کھاؤ گے کیا پیو گے؟"

"تمھی پہلے پئیں گے پھر کھائیں گے؟"

ابن انشاء کھانے پینے کی باتیں بہت کرتا تھا مگر کھاتا بہت کم تھا اور وہ بھی کوئی خاص رغبت کے ساتھ نہیں۔ بہرحال اسی وقت بازار سے قیمے والا قتلمہ اور لال کھوہ سے مشہور بادامی والی برفی منگوائی گئی۔ حسبِ عادت انشاء نے تھوڑا سا قتلمہ اور برفی کی ایک آدھ ڈلی کھائی۔ ریحانہ نے کہا۔

"بھائی جان اگر آپ نہیں کھائیں گے تو یہ سب کچھ آپ کو ساتھ لے جانا پڑے گا۔"

ابن انشاء ہنسا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ میں ڈر گیا تھا کہ تم کہو گی۔ اگر آپ کھائیں گے نہیں تو میں یہ سب کچھ سامنے سے اٹھا لوں گی۔"

اس نے ریحانہ کو گیارہ روپے منہ سلامی کے دیئے اور مجھے ایک چیک انگلش

ٹائی اس شرط کے ساتھ دی کہ میں اُسے اس کے جانے کے بعد باندھوں گا۔ ٹائی اتنی خوبصورت تھی کہ میں نے اُسی وقت باندھ لی۔ ابن انشاء ہنس کر کہنے لگا۔

"اچھا تو تم یہ چاہتے ہو کہ میں چلا جاؤں۔"

میں نے اُسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ ابن انشاء کی دی ہوئی ٹائی آج میرے پاس نہیں ہے۔ خدا جانے کہاں چلی گئی ہے۔ ابن انشاء بھی آج میرے پاس نہیں ہے۔ خدا جانے کہاں چلا گیا ہے۔

پاکستان رائٹرز گلڈ کا پہلا اجلاس ہوا تو کراچی میں ابن انشاء سے پھر ملاقات ہوئی۔ اجلاس خالد دینا ہال میں ہو رہے تھے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ قدرت اللہ شہاب اور جمیل الدین عالی کی شبانہ روز محنتیں بار آور ہو رہی تھیں۔ شہر شہر، گاؤں گاؤں سے ادیب آ کر جمع ہوئے تھے۔ میرا زیادہ وقت ابن انشاء کے ساتھ گزرتا تھا۔ ہم گلڈ کے جلسوں میں بھی شریک ہوتے اور کراچی شہر کی لمبی لمبی سیریں بھی کرتے۔

"اے حمید کراچی مجھے بہت پسند ہے۔ بس ایک بات کی کمی ہے۔ یہاں لاہور کی گلیاں نہیں ہیں۔"

لاہور کی گلیاں ابن انشاء کو بہت یاد آتی تھیں۔ پیرس، ٹوکیو، روم اور نیویارک جا کر بھی وہ لاہور کی گلیوں کو نہیں بھولا تھا۔ لاہور کی پُراسرار گلیوں کا آسیب اُسے ملک ملک ہانٹ کرتا رہا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ گلڈ کا اجلاس ہو رہا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کے مستقبل پر غور ہو رہا ہے۔ بزرگ اور ثقہ قسم کے لوگ بیٹھے ہیں۔ ابن انشاء بڑی سنجیدگی کے ساتھ کسی نکتے پر بحث کر رہا ہے کہ اچانک ہماری نظریں چار ہو گئیں۔ پھر بغیر کسی وجہ کے ہمیں ہنسی کا ایک جھٹکا سا لگا اور اب ہم اپنی ہنسی کو روکنے کے لیے ایک دوسرے سے آنکھیں چرا رہے ہیں۔ ہنسی کا فوارہ اُچھل اُچھل کر اندر سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے اور ہم اُسے دبا رہے ہیں۔ دونوں اس کوشش میں ہیں کہ آنکھیں چار نہ ہونے پائیں کیونکہ

پھر ہنسی کو روکنا سیلاب کو ہاتھوں سے روکنے کے برابر والی بات ہو جاتی۔ ایک دفعہ ابن انشاء سے ضبط نہ ہو سکا، اٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں بھی منہ چھپاتا، ہنسی کو روکتا باہر آ گیا۔ اور پھر ہم کسی کونے میں پیٹ پکڑے پہلے تو خوب ہنسے، پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ آنکھیں رومال سے صاف کیں اور ابن انشاء نے عینک کے شیشوں پر رومال پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"یار! ہم ہنسے کس بات پر تھے؟"

پھر وہ مجھے سرزنش کرتے ہوئے کہتا۔

"کمینے! خبردار اگر پھر مجھے ہنسانے کی کوشش کی۔ تم ابھی تک وہی لاہور والے غیر ذمہ دار کھلنڈرے ہو اور میں اب یہاں بڑا مدبر آدمی ہو گیا ہوں۔"

لیکن جونہی وہ کسی روشندان یا کھڑکی پر کسی چڑیا کو بیٹھے چونچ ہلاتے دیکھتا تو سب کی نظریں بچا کر مجھے ضرور دیکھتا اور پھر ہمارے چہرے لال ہونا شروع ہو جاتے۔ ایک انجانی مگر بڑی زبردست خوشی سے۔

لاہور میں ابن انشاء کے مکان کے باہر جو پیپل کا درخت تھا، اس پہ کسی چڑیا نے گھونسلہ بنا لیا۔ اتفاق سے چڑیا کا بچہ نیچے آنگن میں آ گرا۔ ہم نے اُسے اٹھا کر نہلایا۔ روئی سے اس کے منہ میں چائے کے قطرے ٹپکائے اور گلاب کی جھاڑیوں میں اُسے ایک جگہ گتے کے چھوٹے سے ڈبے میں لٹا کر رکھ دیا۔ ابن انشاء نے کہا

"ارے اسے تو بلی کھا جائے گی۔"

پھر ہم اُسے اٹھا کر اندر لے گئے اور انشاء نے ڈبہ اس طاق کے اوپر رکھ دیا جس میں اس کی کنگھی شیشہ اور شیو کا سامان پڑا رہتا تھا۔ ہم روز چڑیا کے بچے کو دودھ پلاتے۔ پھر آٹے کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر اُسے کھلانے لگے۔ کچھ دنوں کے بعد چڑیا کے بچے کے پر نکل آئے اور پھر ایک روز ہم اُسے لے

کر لارنس باغ آ گئے۔ یہاں میں نے اُسے ہاتھ پر بٹھا کر زور سے اوپر ہوا میں اچھال دیا۔ چڑیا کا بچہ تھوڑا سا اڑا اور پھر گھاس پر گر پڑا۔ انشاء بولا۔

" یار ابھی اسے اڑنا نہیں آیا۔ واپس گھر لے چلتے ہیں۔"

" ارے نہیں۔ تین چار بار اسی طرح ہوا میں اچھالیں گے تو یہ خود بخود اڑ جائے گا۔ تم دیکھتے رہو۔"

پھر ہم نے باری باری چڑیا کے بچے کو ہوا میں اچھالنا شروع کر دیا۔ چھ سات بار گھاس پر گرنے کے بعد وہ ہوا میں جھکولا سا لے کر اوپر کو اٹھا اور املتاس کے درخت پر جا کر بیٹھ گیا۔ ہم بڑے خوش ہوئے اور درخت کے نیچے کھڑے ہو کر منہ اٹھائے اُسے تکنے لگے۔ پھر ہم نے اُسے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا۔ اور واپس چل دیے۔

۱۹۵۲ء میں لاہور سے ایک ہفتہ وار رسالہ "احساس" چھپا کرتا تھا۔ اس پرچے کے ادارہ تحریر میں عباس احمد عباسی، حمید انور اور انور جلال شامل تھے۔ ہیڈ کاتب صاحب کے پاس باہر کے ٹی سٹال کے مالک کبھی کبھار آ کر بیٹھتے تھے۔ یہ صاحب کبڑے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دوپہر کو بڑی سخت گرمی پڑ رہی تھی میں انور جلال کے پاس بیٹھا کوئی رسالہ دیکھ رہا تھا۔ ہیڈ کاتب کے پاس وہی کبڑے صاحب بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ وہ ابھی کھانا کھا کر آئے تھے اور اونگھ رہے تھے۔ پھر وہ اچانک اٹھ کر چل پڑے۔ ہیڈ کاتب نے پوچھا۔

" کہاں چلے؟"

کبڑے صاحب کے منہ سے برجستہ نکل گیا۔

" ذرا کمر سیدھی کرنے جا رہا ہوں۔"

میں اور انور جلال ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اتنا اچھا لطیفہ ہو جائے اور ابن انشاء کو خبر نہ ہو۔ میں اس دھوپ میں باہر نکلا اور [illegible]

کی گلیوں گلیوں ہوتا سیدھا ایبٹ روڈ ابن انشاء کے مکان پر پہنچا۔ اُسے لطیفہ سنایا تو ہنستے ہنستے وہ بھی بے حال ہو گیا۔ میں نے کہا۔

" اس لطیفے کی خوشی میں آج پلازا سینما والی فلم دیکھ لینی چاہیے۔"

ابن انشاء نے کہا۔

" سالے پیسے کہاں سے آئیں گے؟"

میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

" تم میرے ساتھ آؤ۔ سب انتظام ہو جائے گا۔"

اس وقت دن کا ایک بجا تھا شاید۔ ابھی فلم شروع ہونے میں تین گھنٹے باقی تھے۔ میں اُسے لے کر لوہاری دروازے 'ادب لطیف' کے دفتر میں آ گیا۔ ان دنوں مرزا ادیب ایڈیٹر تھے۔ دفتر کی سیڑھیوں میں روک کر ابن انشاء نے مجھ سے پوچھا کہ میرے ذہن میں سکیم کیا ہے۔

" اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ 'ادب لطیف' کے دفتر سے پیسے مل جائیں گے تو یہ وہم دل سے نکال دو۔"

میں نے کہا۔

" میں جانتا ہوں کہ میں چیل کے گھونسلے میں جا رہا ہوں۔ لیکن تم دیکھنا کہ میں آج اس 'ادب لطیف' کی چیل کو کیسے بھون کر کھا جاتا ہوں۔"

اوپر آئے تو میرزا صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ حسبِ عادت ہمیں دیکھ کر بڑی خوف زدہ مسکراہٹ کے ساتھ ملے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ میں نے اپنی سکیم پر عمل شروع کرتے ہوئے کہا۔

" میرزا صاحب کیا خیال ہے اگر اس سال کے بہترین ادب کا انتخاب میں اور ابن انشاء کر دیں۔"

مرزا صاحب تھوڑی کھجانے لگے۔ مکتبہ اردو کی طرف سے اُن دنوں ہر سال کا بہترین شعری اور نثری انتخاب کتابی صورت میں چھپا کرتا تھا جسے مختلف ادیب

شاعر اور نقاد حضرات مرتب کرتے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ ۵۸ء کا انتخاب ابھی شائع نہیں ہوا اور مسئلہ زیرِ غور ہے۔ میرزا صاحب بولے۔

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ میں آج ہی چوہدری برکت علی صاحب سے بات کرتا ہوں۔"

"اُن سے میں نے بات کر لی ہے میرزا صاحب"

"بس تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ بسم اللہ کر دی جی"

میں نے چوہدری صاحب سے کوئی بات نہیں کی تھی اور ان سے بات کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ابن انشاء بار بار میری طرف دیکھ رہا تھا اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پلازا سینما والی فلم کے ساتھ سٹے ہو کے بہترین ادب کے انتخاب کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ میں نے ابن انشاء کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بس بھئی انشاء! تم نظم کا حصہ سنبھال لو۔ میں افسانے کا انتخاب کرتا ہوں۔ کام آج ہی سے، بلکہ ابھی سے شروع ہو جانا چاہیے۔"

پھر میں نے مرزا صاحب کی طرف دیکھ کر بڑا پکا منہ بنا کر کہا۔

"اب آپ ایسا کریں کہ ہمیں ہندوستان اور پاکستان کے ادبی پرچے عنایت کر دیں تاکہ انہیں پڑھ کر ہم انتخاب پر کام شروع کر دیں۔"

مجھے معلوم تھا کہ 'ادب لطیف' کے دفتر کے ایک کمرے میں ہر قسم کے ادبی رسالوں کا انبار لگا رہتا ہے۔ میرزا صاحب بولے۔

"بھئی اندر جا کر اپنی مرضی کے رسالے چن لیں۔"

ہم ساتھ والی کوٹھڑی میں آ گئے۔ ابن انشاء اندر آتے ہی بولا۔

"کم بخت! یہ کیا مصیبت مول لے رہے ہو؟ ان رسالوں کو کون پڑھے گا؟"

میں نے کہا۔

"شش! خاموش رہو اور دیکھتے جاؤ۔"

میں نے یونہی اِدھر اُدھر سے پنجابی گورمکھی ہندی وغیرہ کے رسالے اٹھا

کر ان کا گٹھا بنایا اور باہر لے آیا۔ مرزا ادیب نے ہندی گورمکھی رسالے دیکھ کر حیرانی سے پوچھا۔

"مولانا! یہ رسالے کون پڑھے گا؟"

میں نے کہا۔

"مرزا صاحب! میں بڑی ایمانداری کے ساتھ ادبی نگارشات کا انتخاب کرنا چاہتا ہوں۔ میرے ایک دوست ہندی گورمکھی پڑھنا جانتے ہیں چاہے مجھے ساری رات جاگنا پڑے لیکن میں اُن صاحب کے پاس بیٹھ کر ان رسالوں میں چھپے ہوئے افسانوں کا ایک ایک لفظ سنوں گا۔ اور پھر انتخاب کروں گا۔"

مرزا صاحب! میرے اس مجاہدانہ عزم پر بڑے خوش ہوتے کہنے لگے۔

"پھر تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس بار کا انتخاب بہترین ہو گا۔"

"انشاء اللہ!"

اور ہم دونوں رسالوں کے دو گٹھے لے کر ادبِ لطیف کے دفتر سے نیچے اُتر آئے۔ مرزا صاحب نے بہت اصرار کیا کہ ابھی چپراسی آ جاتا ہے وہ خود اٹھا کر تانگے میں رکھوا دے گا، لیکن میں نے کہا کہ یہ ادب کی خدمت ہے۔ اسے ہم اکیلے ہی کرنا چاہتے ہیں۔ بازار میں آئے تو ابن انشاء نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ان گناہ کی گٹھڑیوں کو کہاں لے جانا ہے؟"

میں نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"ابھی ادب کی خدمت کرتے ہیں۔ چپ رہو اور میرے پیچھے چلے آؤ۔"

سو رسالے ابن انشاء کے گٹھے میں تھے اور سو ہی رسالے میرے گٹھے میں تھے۔ میں سرکلر روڈ کراس کر کے موری گیٹ کے باہر آ گیا۔ یہاں سے بدرو کی طرف ہو گیا۔ ابن انشاء میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ یہاں ردی خریدنے والوں کی بے شمار دکانیں بدرو

کے ساتھ ساتھ لوہاری گیٹ تک چلی گئی تھیں۔ یہ ہول سیل ردی خریدتے تھے۔ باہر اسلامی ترازو لگے تھے اور دکانوں میں ردی اخباروں، رسالوں کاپیوں اور کاغذوں کے انبار لگے تھے۔ میں نے ابن انشاء کو آنکھ ماری اور ہم نے دونوں گٹھے ایک دکاندار کے آگے رکھ دیئے۔

"رسالوں کی ردی آپ کیا بھاؤ لیتے ہیں؟"

اب ابن انشاء سمجھ گیا تھا کہ ہم کس طرح کے بہترین ادب کا انتخاب کس طرح کرنا چاہتے ہیں۔ اس زمانے میں وہ رسالے ردی کے بھاؤ کوئی پندرہ روپوں میں بکے۔ روپے جیب میں ڈال، بہترین ادب کا انتخاب کر کے ہم بدرو کے کنارے کنارے شاہ عالمی دروازے کی طرف نکل گئے۔ یہاں سے ہم نے تانگہ کرایا اور سیدھا پلازا سینما آ گئے۔ جہاں بورس کارلوف کی ڈراؤنی فلم لگی ہوئی تھی۔ ابن انشاء ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

"ایسا انتخاب تو ہم ہر مہینے کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"میں ہر روز کرنے کو تیار ہوں۔"

ابن انشاء نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"اسے کہتے ہیں بہترین انتخاب۔ مگر یار بعض رسالے بڑے قیمتی تھے اور بالکل تازہ۔"

میں نے کہا۔

"ارے فلم بھی تو دیکھو کس کی لگی ہے۔ بورس کارلوف۔ اور پھر ڈراؤنی۔ ہیبت ناک۔ چلو ٹکٹ لیتے ہیں۔"

(پہلی قطار میں کھڑے ہوئے دائیں سے بائیں)

حسن طاہر، شریف کنجاہی۔ عبداللہ ملک۔ حمید اختر۔ اکرم انگار۔ جمیل ملک

(بیٹھے ہوئے دوسری قطار)

طفیل احمد خان۔ عبدالمجید بھٹی۔ احمد ندیم قاسمی۔

(بیٹھے ہوئے تیسری قطار میں)

اے حمید۔ احمد راہی۔ قتیل شفائی

(باغ جناح میں چوہدری برکت علی مالک مکتبہ اُردو کی جانب سے دی گئی ایک دعوت میں)

اے حمید اور اصغر سلیم
(پاک ٹی ہاؤس کے باہر)

(دائیں سے بائیں کھڑے ہوئے)

حسن طاہر۔ ابراہیم جلیس۔ قتیل شفائی۔ جمیل ملک۔ اکرم افکار

(بیٹھے ہوئے دائیں سے بائیں)

احمد راہی۔ احمد ندیم قاسمی۔ مولانا چراغ حسن حسرت۔ عبدالمجید بھٹی۔ مولانا صلاح الدین احمد اور اے حمید

(چوہدری برکت علی مالک مکتبہ اُردو کی ایک دعوت کے موقع پر باغِ جناح میں)

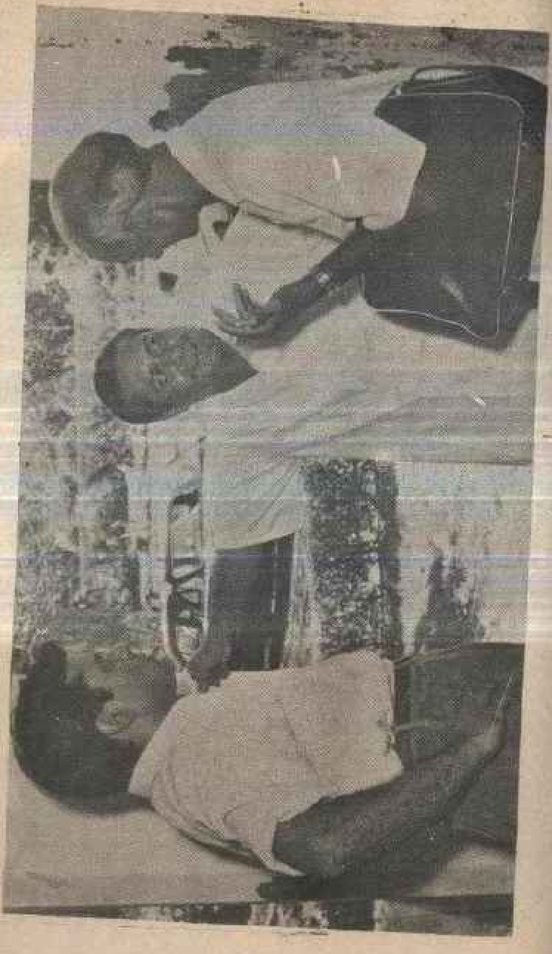

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم۔ قدرت اللہ شہاب۔ اے حمید

(ساحر لدھیانوی کے چند بچھڑے اور کورے میں) اے حمید۔ احمد راہی۔ عبدالمتین عارف
(چینی لنچ ہوم کے باہر)

(دائیں سے بائیں) اے حمید۔ طفیل احمد خان۔ محمد صفدر میر۔
احمد راہی۔ عبداللہ ملک۔ فیض احمد فیض۔
حمید اختر۔ احمد ندیم قاسمی۔ ابراہیم جلیس۔
عبدالمجید بھٹی۔ عارف عبدالمتین اور چوہدری نذیر۔
(سویرا کی دعوت۔ باغ جناح)

(دائیں سے بائیں) نصیر انور - اے حمید - شہرت بخاری
سعید اور منیر نیازی

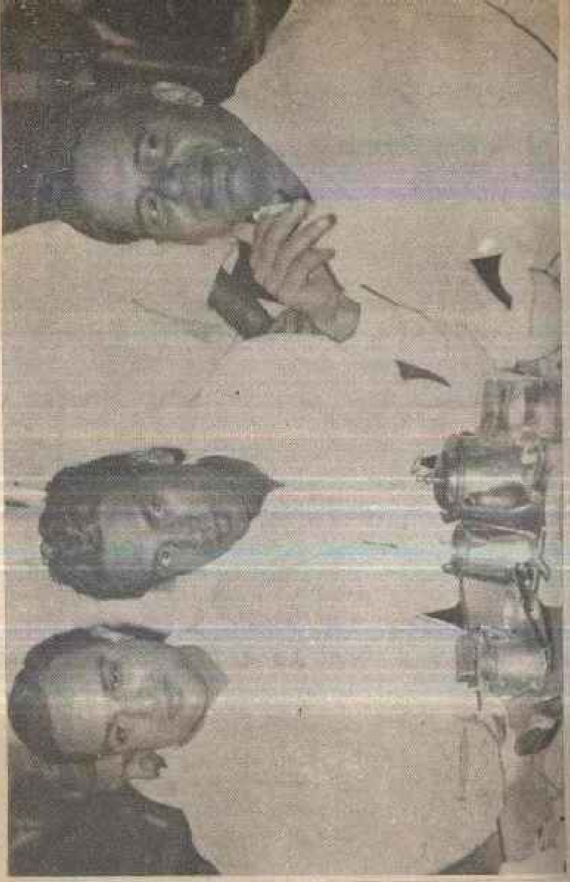

اے حمید
ابراہیم جلیس
ایک
چائے
کی
دعوت
میں

(دائیں سے بائیں اگلی قطار) عبدالمجید بھٹی - احمد راہی - طفیل احمد خان - ظہیر کاشمیری -
محمد صفدر میر - عارف عبدالمتین -
(پچھلی قطار) ابراہیم جلیس - حمید اختر - سید ایوب کرمانی - عبداللہ ملک -
احمد ندیم قاسمی اور اے حمید
(باغ جناح میں "سویرا" کی طرف سے دی گئی ایک دعوت کے بعد)

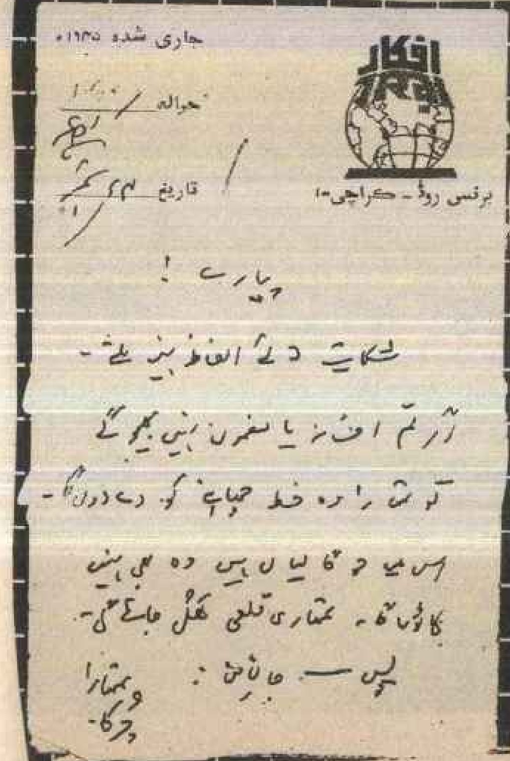

جاری شدہ ۱۹۴۵ء

افکار

برنس روڈ - کراچی ۱

حوالہ

تاریخ

پیارے !

شکایت کے لئے الفاظ نہیں ملے۔

اگر تم افسانہ یا مضمون نہیں بھیجو گے

تو تمہارا خط حجاب کو دے دوں گا۔

اس میں جو گالیاں ہیں وہ بھی اپنی

کالو جاتا ہے۔ تمہاری قلعی کھل جائے گی۔

پس — جان لو :

تمہارا

چرکا۔

رائٹرز گلڈ کے اجلاس ختم ہوگئے اور میں کراچی سے لاہور روانہ ہوا۔

ابن انشاء مجھے چھوڑنے ریلوے سٹیشن تک آیا۔ ابھی گاڑی چلنے میں کچھ وقت تھا۔ ہم ایک سٹال پر کھڑے ہو کر چائے پینے لگے۔ ابن انشاء کی جدوجہد کراچی میں بھی جاری تھی، لیکن اُسے لاہور میں گزارے ہوئے دن بہت یاد آرہے تھے۔ وہ بار بار مجھ سے لاہور کے دوستوں۔ لاہور کی گلیوں۔ لاہور کے باغوں اور ریستورانوں، پاک ٹی ہاؤس، انڈیا کافی ہاؤس۔ اور لارنس باغ کے املتاس کے درخت کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ کیا مس لنجلا اب بھی بیٹرو ہوٹل میں ڈانس کرتی ہے اور لوگ چائے کی چینکوں میں بادہ انگور سے شغل کرتے ہیں؟ کیا پاک ٹی ہاؤس میں ادیبوں کے جمگھٹے اسی طرح لگتے ہیں؟ حمید اختر کیا کرتا ہے؟ لارنس باغ کے املتاس کے درخت پر زرد پھولوں کے گچھے اسی طرح خوشبوئیں اڑاتے ہیں؟ سبط حسن کے پائپ کا کیا حال ہے؟ چوہدری نذیر اسی طرح تم لوگوں کو گجریلہ اور مچھلی کھلاتے ہیں؟ مالک و مدیر "سویرا" چوہدری نذیر کو کھانے اور کھلانے کا بہت شوق تھا۔ وہ مجھ سے احمد راہی اور ابن انشاء سے خاص طور پر بہت پیار کرتے تھے۔ ہمیں خاص طور پر گجریلا کھلانے اپنے بھاٹی دروازے والے گھر لے جاتے۔ اُن کے ہاں غضب کا گجریلا پکتا تھا۔ دودھ ایسا مصفا اور خالص ہوتا تھا کہ جیسے پہاڑ چیر کا نکلا گیا ہو۔

پستے بادام تو گویا خاص طور پر کشمیر سے منگوائے جاتے اور سب سے خوبصورت اور حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ چوہدری صاحب سامنے بیٹھ کر ہمیں کھلاتے۔

"یار حمید یہ بھی کھاؤ۔ یار راہی وہ بھی کھاؤ۔ ابن انشاء یہ بادام بھی چکھو۔ خالص کاغذی ہیں۔ اگر تم روزانہ میرے پاس آکر یہ بگھریلا کھاؤ تو خدا کی قسم دو ہفتے بعد تمہاری عینک اتر جائے"

ابن انشاء مسکرا کر کہتا۔

"چوہدری صاحب! اگر میری عینک اُتر گئی تو میں بگھریلا کیسے دیکھ سکوں گا؟"

احمد راہی ہنس کر کہتا۔

"پھر تمہیں ہر طرف بگھریلا ہی بگھریلا نظر آئے گا۔"

ایک بار چوہدری صاحب نے خاص طور پہ ہمارے لیے گھر پہ مچھلی بنوائی۔ ایسی مچھلی میں نے پھر کبھی نہیں کھائی۔ چوہدری صاحب نے مچھلی کی ایک گدی کے اوپر سے تلی ہوئی چربی اتار کر میرے نان پر رکھتے ہوئے کہا۔

"لے کھاؤ اے حمید۔ بس کاڈ لیور آئل ہی ہے۔"

ایک روز میں اور ابن انشاء حسب معمول سویرا کے دفتر گئے تو معلوم ہوا کہ مشہور افسانہ نگار عزیز احمد آئے ہوئے ہیں اور ابھی ابھی "ادب لطیف" کے دفتر میں گئے ہیں۔ حال ہی میں ان کی کہانیاں "زریں تاج" اور "مدن سینا اور صدیاں" چھپی تھیں۔ جو ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بنی ہوئی تھیں۔ ان کے ناول "گریز" کی ہم لوگوں میں بڑی دھوم تھی وہ اپنی طرز کا بڑا مزے دار سفرنامہ تھا۔ ہم ادب لطیف کے دفتر میں گئے۔ عزیز احمد سے ملے۔ انھوں نے کہا۔

"بھئی ذرا ہمیں انار کلی کی سیر کراؤ۔"

انار کلی کی سیر ہم سارا دن ہی کرتے رہتے تھے۔ لوہاری دروازے سے

کسی خوب صورت لڑکی کی تعریف کرتے انار کلی میں داخل ہوتے اور نیلا گنبد پہنچ کر پھر کسی خوب صورت لڑکی کا تعاقب کرتے واپس لوہاری دروازے آجاتے۔ معلوم ہوا کہ عزیز احمد کو لڑکیوں سے دلچسپی صرف ناول کی حد تک ہے جب کہ ہم ناول تک آتے آتے لڑکیوں کو پیچھے چھوڑ دیتے تھے۔ ہم نے انھیں انار کلی کی خوب سیر کرائی ایک جگہ حلوائی کی دکان دیکھ کر بولے۔

"بھئی ہم جب بھی لاہور آتے ہیں لسی ضرور پیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک ایک گلاس لسی کا ہو جانا چاہیے۔"

ہم نے ایک ایک گلاس لسی کا پیا۔ عزیز احمد بڑے خوش ہوئے۔ ابن انشاء کہنے لگا۔

"اب اگر ہم پاک ٹی ہاؤس جا کر چائے کی پوری چینک بھی پی جائیں تو اس کی خشکی اثر نہیں کر سکتی۔"

ابن انشاء کو چائے کی خشکی کا بڑا خیال رہتا تھا شاید اسی لیے وہ دوپہر کو گھی شکر کھانے کے بعد ضرور کھایا کرتا۔ ہم پاک ٹی ہاؤس آگئے۔ یہاں دوسرے کئی ادیبوں اور شاعروں سے عزیز احمد کی ملاقات ہو گئی۔ چائے کے دور چلنے لگے۔ ٹی ہاؤس کی فضا میں روشنی چمک اور شباب کی گرمجوشی پیدا ہو گئی۔ اس فضا میں کبھی کبھی انور جلال کے چونکا دینے والے قہقہے گونج جاتے۔ پاک ٹی ہاؤس میں داخل ہونے کے بعد وقت کی رفتار شاید تھم جاتی تھی۔ ہمیں پتا ہی نہ چلا اور باہر رات بھی ہو گئی۔ عزیز احمد سواری لے کر رخصت ہو گئے۔ کراچی ایکسپریس نے سیٹی دی تو ہم چونکے۔

"ارے اکم بخت تیری گاڑی چھٹنے والی ہے۔ جلدی کر۔"

ابن انشاء نے کہا۔ میں ڈبے میں گھس کر اپنی سیٹ پر کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔

"یار انشاء! ابھی جی نہیں بھرا۔ دل تو یہی چاہتا ہے کہ تیرے پاس کچھ دن اور ٹھہرتا۔"

انشاء جھٹ بولا۔

"اسی لیے تو میں سٹیشن تک تیرے ساتھ آیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

وہ ہنسا۔

"مطلب یہ کہ میں تمہاری عزت افزائی کے لیے تھوڑا یہاں تک آیا ہوں۔ میں تو یہ دیکھنے آیا ہوں کہ تو جاتا ہے کہ نہیں۔"

ٹرین چل پڑی اور ابن انشاء کا ہنستا مسکراتا چہرہ بھیڑ میں گم ہو گیا۔ ٹرین چھوٹے چھوٹے سٹیشن چھوڑتی، دھواں اور گرد اڑاتی لاہور کی طرف اڑی چلی جا رہی تھی اور مجھے ابن انشاء کی باتیں، اس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے یاد آ رہے تھے۔ ابن انشاء کے لاہور سے چلے جانے سے میرا ساتھی مجھ سے بچھڑ گیا تھا، ایک ایسا ساتھی —— جو میرا ہمراز تھا۔ ہم خیال تھا۔ ابن انشاء لاہور میں اپنی خوبصورت یادوں کے ایسے درخت چھوڑ گیا جن پر خزاں کے موسم میں بھی پھول کھلتے تھے اور میں ان پھولوں کی خوشبوؤں میں انشاء کو یاد کیا کرتا تھا۔ اب تو ابن انشاء کراچی میں بھی نہیں ہے۔ دنیا کے کسی شہر میں نہیں ہے اور اب اس کی یادوں کے درختوں پر پھول مرجھانے لگے ہیں اور شاخوں کے پتے زرد ہو کر سارا سال گرتے رہتے ہیں، اور میں ان مرجھاتے پھولوں اور گرتے پتوں میں بیٹھا اپنے انشاء کو یاد کرتا رہتا ہوں کہ کسی وقت اس کے قہقہے کی آواز آتی ہے۔ چونک کر چاروں طرف دیکھتا ہوں۔ کوئی بھی نہیں ہوتا۔

زرد پتے نیچے گرنے لگتے ہیں۔ درختوں کے زرد آنسو!

"سویرا" کی جانب سے لاہور کے لارنس باغ میں ترقی پسند مصنفین کو ایک دعوت دی گئی۔ اس میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، عبدالمجید بھٹی، سبط حسن، ابراہیم جلیس، صفدر میر، حمید اختر، عبداللہ ملک، شریف کنجاہی، احمد راہی، ابن انشاء، ایوب کرمانی، قتیل شفائی، مولانا صلاح الدین احمد، مولانا چراغ حسن حسرت، میرزا ادیب، قیوم نظر، یوسف ظفر، تنویر نقوی، ظہیر کاشمیری، حسن طاہر، جمیل ملک اور میں نے شرکت کی۔ لارنس باغ کے گلستان فاطمہ کی ان دنوں نئی نئی تزئین ہوئی تھی۔ اس یادگار تقریب کے گروپ فوٹو آج بھی میرے پاس ہیں۔ یہ آج سے چھبیس برس پہلے کی تصویریں ہیں۔ لوگ پہچانے نہیں جاتے۔ ان تصویروں میں نہ صرف یہ کہ لوگوں کے بال کالے ہیں بلکہ موجود ہیں۔ جوان، تروتازہ، زندگی سے بھرپور شگفتہ چہرے ہیں۔ اب ان لوگوں کو دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو چھبیس برس پہلے لارنس باغ میں گلستان فاطمہ میں جمع تھے۔

چوہدری نذیر نے بڑا اہتمام کر رکھا تھا۔ کیک پیسٹری کے علاوہ شہر سے بہترین قسم کی مٹھائی بھی منگوائی تھی۔ اوپن ایئر کیفے کے باغ میں میزیں جوڑ کر کرسیاں لگا دی گئی تھیں۔ چائے کا دور شروع ہوا۔ گویا اک دبستان کھل گیا۔ ایسے ایسے لطیفے ہوتے ایسی ایسی باتیں ہوئیں کہ حسرت ہوتی ہے کہ کاش اس زمانے میں انھیں کوئی ٹیپ کر لیتا۔ ابن انشاء کے دانت میں درد تھا۔ حمید اختر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"انشاء! یہ بتاؤ تمہارے کھانے کے دانت میں درد ہے یا دکھانے کے دانت میں؟"

ابن انشاء نے ایک ہاتھ سوچتے ہوئے گال پر رکھ کر کہا۔

"کھانے کے دانت میں۔"

سبط حسن نے کہا

"بھئی انشاء جی! آپ اس دانت کو کیوں نہیں نکلوا دیتے؟"

حمید اختر نے کہا

"اگر یہ میرا دانت ہوتا تو فوراً نکلوا دیتا۔"

ابنِ انشاء بولا۔

"میں بھی نکلوا دیتا اگر یہ تیرا دانت ہوتا۔"

لاہور کے ایک سیلانی فوٹوگرافر حفیظ قندھاری نے اس گروپ کی تصویریں اُتاریں۔ حفیظ قندھاری بڑے ماہر فوٹوگرافر ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تصویر اُتار لیتے ہیں مگر دیتے کبھی نہیں۔ لاہور کے ایک نوجوان شاعر نے اُن سے ایک تصویر بنوائی۔ ہفتے بعد حفیظ قندھاری سے ملاقات ہوئی تو نوجوان شاعر نے تصویر مانگی۔ حفیظ نے کہا۔ "لے یہ لو یار! اتنی جلدی بھی کیا ہے" اب نوجوان شاعر نے حفیظ کے پیچھے پیچھے پھرنا شروع کر دیا۔ لیکن حفیظ غائب ہو گیا۔ لاہور میں ہی غائب ہو گیا۔ اُس میں یہ خوبی بھی تھی کہ وہ سڑک پر چلتے چلتے غائب ہو جاتا تھا۔ ابھی پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھا چائے پی رہا ہے اور ابھی غائب ہے۔ بہر حال حفیظ قندھاری نے نوجوان شاعر کو تصویر ضرور دی مگر اس وقت جب وہ اپنی پچاسویں سالگرہ منا رہے تھے۔ حفیظ قندھاری کہہ رہا تھا کہ یہ تمہاری تصویر ہے اور شاعر کہہ رہا تھا کہ نہیں یہ میری تصویر نہیں ہے۔ میرے بچے کی تصویر ہے۔ ترقی پسند مصنفین کے گروپ کی تصویریں اُتار کر وہ اپنی عادت کے مطابق غائب ہو گیا۔ سب دوستوں کو معلوم تھا کہ یہ شخص تصویریں کبھی نہیں دے گا۔ لیکن ایک روز اتفاق سے میں کافی ہاؤس میں بیٹھا تھا کہ حفیظ قندھاری کیمرہ بغل میں لٹکائے آ گیا۔ اُس نے مجھے اس گروپ فوٹو کے تین پروف دکھائے۔

"یہ پروف ہیں؟ ابھی انہیں ڈی ویلپ کروں گا۔"

میں نے تینوں پروف اس سے لیے اور غائب ہو گیا۔ یوں اس یادگار گروپ کی یہ تصویریں میرے پاس محفوظ رہ گئیں۔ افسوس اس میں ابنِ انشاء نہیں ہے۔ دانت کے درد کی وجہ سے وہ تصویر اتروانے سے کچھ دیر پہلے چلا گیا تھا۔

حلقۂ اربابِ ذوق کا اجلاس وائی ایم سی اے کے بورڈ روم میں ہوا کرتا تھا۔ لمبی چوڑی میز کے گرداگرد کرسیوں پر لوگ بیٹھ جاتے۔ بڑے زوردار اجلاس ہوا کرتے تھے۔ گرما گرم بحثیں ہوا کرتیں جن میں سبھی احباب حسبِ مقدور حصّہ لیتے۔ وہاں قاعدہ تھا کہ ایک کاغذ کا خالی صفحہ پنسل کے ساتھ شرکائے محفل میں ہاتھوں ہاتھ گھوما کرتا جس پر لوگ اپنا نام لکھ دیتے۔ پھر یہ نام اگلے اجلاس میں پچھلے ہفتے کی کارروائی سناتے ہوئے پڑھے جاتے کہ فلاں فلاں صاحب اجلاس میں شریک تھے۔ ہم شرارتیں ضرور کیا کرتے۔ ایک اجلاس میں ابنِ انشاء اور میں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ کاغذ کا پرچہ ہمارے پاس آیا تو میں نے اپنا نام بغدادی چور لکھ دیا۔ ابنِ انشاء نے اپنا نام خلیفہ ہارون الرشید لکھ دیا۔ قیوم نظر صدارت کر رہے تھے۔ جب پرچہ اُن کے پاس گیا تو اُن کی نظر پڑ گئی۔ مسکرا کر بولے۔

"حضرات! آپ کو سُن کر خوشی ہو گی کہ ہمارے آج کے اجلاس میں بغداد سے خلیفہ ہارون الرشید اور بغدادی چور بھی تشریف لائے ہوئے ہیں۔"

لوگوں نے ایک دوسرے کو دیکھنا شروع کر دیا۔ جس روز حلقے کے اجلاس میں سعادت حسن منٹو افسانہ پڑھنے آتے اس روز محفل بڑی دلچسپ ہو جاتی۔ منٹو صاحب بڑی تیز باتیں کرتے۔ ایک بار انھوں نے افسانہ پڑھا تو ایک صاحب نے فرمایا کہ اس کہانی میں فلاں فلاں چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ منٹو صاحب اپنی عقابی نظروں سے اُسے کچھ دیر دیکھتے رہے جب وہ صاحب بات ختم کر چکے تو منٹو نے ان کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے کہا۔

"مجھے تمہارے دماغ میں عقل کی کمی محسوس ہوتی ہے۔"

ایک بار حلقے کے اجلاس میں میرا افسانہ تھا۔ منٹو صاحب سے سیڑھیوں میں میری ملاقات ہوئی۔ میں نے ادب سے سلام کیا۔ کہنے لگے۔

"اے حمید آج میں تیری کھال کھینچوں گا۔"

میں نے افسانہ پڑھا۔ منٹو صاحب نے حسبِ وعدہ میری کھال بھی کھینچی اور کچھ

تعریف بھی کی۔ میرا جی کی یاد میں حلقے کا جو سالانہ اجلاس ہوتا اس میں میرا جی کے چھوٹے بھائی کاشی صاحب دامن پر میرا جی کا پسندیدہ راگ بے جے ونتی ضرور سناتے۔ ایک دفعہ منٹو صاحب ترنگ میں تھے۔ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ہتھیلی کا پستول بنا کر اسے دو تین بار جھٹکا اور بولے۔

"ادے تمہیں کیا پتا ہے جے ونتی کیا ہوتا ہے۔۔۔۔؟"

ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں زیادہ گرمجوشی ہوا کرتی یہاں افسانے یا کسی نظم پر بحث ہوتی تو لاطینی امریکہ سے کر کوریا تک کے حوالے دیئے جاتے اور ہیگل کی جدلیات بھی زیر بحث آجاتیں۔ ظہیر کاشمیری اور عبداللہ ملک بولنا شروع کرتے تو سامعین صاحب صدر کے ہاتھ جوڑ جوڑ کر انہیں چپ کراتے۔ ابراہیم جلیس نے ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں اپنا حیدر آباد کا رپورتاژ پڑھا تو اس کی بڑی دھوم مچی اور کئی روز ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس میں اس پر باتیں ہوتی رہیں۔

پاک ٹی ہاؤس میں ابن انشا، میں اور ناصر کاظمی بیٹھے شعر و ادب پر گفتگو کر رہے تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ ناصر کاظمی کا سگریٹ اپنے آخری کنارے تک پہنچ گیا تھا لیکن وہ اسے دو انگلیوں میں پکڑے بڑے ماہرانہ انداز میں پھر بھی پیے جا رہا تھا۔ ناصر کاظمی سگریٹ کو اس کے آخری کنارے تک پیتا تھا۔ گفتگو انبالے، پھلور اور امرتسر کی برساتوں پر ہو رہی تھی۔ ہم اپنے اپنے شہروں کی برساتوں کی تعریفیں کر رہے تھے۔ میں نے ناصر کاظمی سے کہا۔

"ناصر! تمہیں ایک مثنوی لکھنی چاہیے۔ جس میں صرف تمہارے شہر کے موسموں، بارشوں، درختوں اور پرندوں کا ذکر ہو۔"

ابن انشاء بولا۔

"انسانوں کا ذکر کیوں نہ ہو؟"

"ہاں اگر وہاں انسان ہوں تو اُن کا بھی ذکر کر دینا۔"

ناصر کاظمی نے سگریٹ سے دوسرا سگریٹ لگایا۔ پہلا سگریٹ اتنا چھوٹا سا رہ گیا تھا کہ اس کے ہاتھ میں ہی کہیں گم ہو گیا۔ مسکرا کر بولا۔

"اے حمید میرے شہر کی برسات سے انناس کی خوشبو آیا کرتی تھی۔ میں نے ایک مثنوی شروع کر رکھی ہے۔ کسی وقت اس کے کچھ شعر سناؤں گا۔"

ابن انشاء نے کہا

"سالے جب ہم بوڑھے ہو گئے ہوں گے تب تم وہ مثنوی پوری کرو گے۔"

ناصر کاظمی مسکراتا رہا اور اپنا ہاتھ ہونٹوں کے پاس کئے سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتا رہا۔ ناصر کاظمی کی مثنوی کبھی مکمل نہ ہوئی۔ حال ہی میں اس کی ایک کتاب 'بارش' شیخ غلام علی اینڈ سنز نے شائع کی ہے۔ اس میں ایک ہی غزل مسلسل ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید یہ اُسی مثنوی کا ایک حصہ ہے جو ناصر کاظمی نے آج سے اٹھائیس برس پہلے شروع کی تھی اور جسے وہ ختم نہ کر سکا تھا۔ ناصر کاظمی اٹھ کر چلا گیا۔ میں اور ابن انشا اپنے اپنے شہروں کی باتیں کرنے لگے۔ میں نے ابن انشاء کو بتایا کہ میں نے پھلور شہر دیکھا نہیں۔ ہاں اس کے سٹیشن سے دلی، کلکتے آتے جاتے کئی بار گزرا ہوں۔ ابن انشاء بولا۔

"پھلور کا سٹیشن تو چھوٹا سا تھا البتہ انبالے کا سٹیشن بڑا وسیع تھا۔"

میں نے کہا۔

"مجھے انبالہ کینٹ سٹیشن زیادہ پسند تھا۔ کشادہ صاف ستھرے پلیٹ فارم، اونچی چھت اور رنگین رسالوں سے سجے ہوئے بک سٹال، جب ریل انبالہ چھاؤنی سے باہر نکلتی تو کافی دور تک نیم کے گھنے درخت ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جاتے۔"

"ہمارے ہاں نیم کے پیڑ بہت تھے۔ برسات کے دنوں میں بھی

بی چڑیاں لگتیں تو ان درختوں میں راتوں کو کوئلیں
بولا کرتی تھیں۔"

اتنا کہہ کر ابن انشا اپنے شہر کی برساتوں میں اور میں امرتسر کی یادوں میں کھو گیا۔ میں نے ٹی ہاؤس کے شیشے میں سے اشفاق احمد کو باہر سائیکل کھڑی کرتے دیکھا اور انشاء سے کہا۔

"گڈریا آگیا ہے۔"

ان دنوں اشفاق احمد کی کہانی "گڈریا" کا بڑا شہرہ تھا اور میں اُسے گڈریا کہا کرتا تھا۔ اشفاق کے ساتھ ہی مزید چائے آگئی۔ ایک بار پھر گرمجوشی سے باتیں شروع ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد میں اور انشاء ٹی ہاؤس سے اُٹھ کر مال روڈ پر آگئے اور چیرنگ کراس کی جانب چل پڑے۔ مال روڈ پر اتنا رش نہیں ہوا کرتا تھا۔ شور بھی نہیں ہوتا تھا۔ مال کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے پیپل کے درختوں پر چڑیاں طوطے اور کوّے بڑے آرام سے بیٹھے اپنی اپنی بولیاں بولا کرتے تھے۔ ہم ہنستے مسکراتے، فقرے چُست کرتے "لورینگز" میں آکر بیٹھ گئے۔ ہمارے پاس تین روپے تھے۔ چائے منگوائی اور باتیں کرنے لگے۔ خدا جانے وہ کیا باتیں تھیں کہ ختم ہونے میں ہی نہ آتی تھیں۔ ایک موضوع ختم ہوتا تو دوسرا شروع ہو جاتا۔ "لورینگز" کا ماحول نسبتاً پُرسکون تھا۔

یہاں سے اُٹھے تو لارنس باغ کی سیر کرنے لگے۔ پھر چڑیا گھر آگئے اس کے بعد اوپن ایئر کیفے میں بیٹھ کر پھر چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ شام کو میں نے ابن انشاء کو اس کے گھر چھوڑا اور واپس ٹی ہاؤس آگیا۔ یہاں آدھی رات تک محفل جمی رہی۔ رات بارہ بجے کے قریب میں اُٹھا اور اپنے گھر مصری شاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ دو بجے رات تک ایک افسانے پر کام کرتا رہا۔ پھر سو گیا۔ صبح اُٹھ کر سیر کو نکل گیا۔ واپس آکر ناشتا کیا اور سیدھا ابن انشاء کے گھر پہنچ گیا۔ ابن انشاء کے والد صاحب آنگن میں چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ میں نے

ادب سے سلام کیا۔ انھوں نے بتایا کہ شیر محمد ابھی سو رہا ہے۔ میں ان کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ ابن انشاء کے والد بڑے مرنجانِ مرنج، کم سخن اور محبت کرنے والے بزرگ تھے۔ خالص ضلع جالندھر کے میٹھے لہجے میں بات کرتے۔ تھوڑی دیر بعد انشاء بھی آنکھیں ملتا، عینک جماتا آگیا۔

"ارے تم رات کو سوتے بھی ہو کہ نہیں؟"

میں نے آنکھ مار کر کہا۔

"بس اَب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

اس کے بعد پھر وہی دن بھر کی آوارہ گردیوں کا سلسلہ چل نکلا۔ دوپہر کے وقت انشاء نے کہا کہ ذرا اخبار زمیندار کے دفتر تک چلنا ہے۔ ایک ضروری خبر دیکھنی ہے۔ ہم مال روڈ سے چل کر زمیندار کے دفتر آگئے۔ یہ بڑی شروع شروع کی بات ہے۔ ابھی مولانا ظفر علی خاں حیات تھے۔ اگرچہ کافی ضعیف ہو چکے تھے۔ کاتب حضرات تخت پوش پر بیٹھے دیوار سے ٹیک لگائے لکھ رہے تھے۔ میز پر اشرف عطا اور تاثیر رضوی صاحب بیٹھے خبروں کی کانٹ چھانٹ کر رہے تھے۔ عقبی کمرے میں ظہور الحسن ڈار بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ منصور علی خان ہمیں اپنے کمرے میں لے گئے۔ انھوں نے ہمارے لیے چائے منگوائی۔ ابن انشاء نے کہا۔

"مولانا پچھلے جمعرات کا زمیندار اخبار منگوا دیجیے۔"

اتنے میں مولانا اختر علی خان اندر آگئے۔ انھوں نے بڑے تیز تیز لہجے میں منصور سے کوئی بات کی جسے ہم بالکل نہ سمجھ سکے۔ منصور اپنے والد بزرگوار کی ہر بات پر سر ہلا کر کہتا رہا۔

"بجا ارشاد! بجا ارشاد!"

جب مولانا چلے گئے تو منصور نے سر کھجاتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آیا ابا کیا کہہ گئے ہیں۔"

منصور علی خان کے کمرے سے باہر نکلے تو دیکھا کہ نیوز روم میں مولانا ظفر علی خان آرام کرسی پہ تشریف رکھے کسی اخبار کا تراشہ پڑھ رہے ہیں۔ ہم نے بڑی عقیدت سے آگے بڑھ کر اُن سے ہاتھ ملایا اور احتراماً کچھ دیر اُن کے پاس ہی تخت پوش پر بیٹھے رہے۔ مولانا بڑے ضعیف ہو گئے تھے۔ پھر بھی انہوں نے کمزور آواز میں ہماری خیر خیریت پوچھی۔ ہم سر جھکائے بیٹھے اُن کی خاموشی سے ہی لطف اندوز ہوتے رہے جس میں ہزاروں داستانیں سانس لے رہی تھیں۔

"زمیندار" کے دفتر سے ہم پیدل ہی چوک لکشمی کی طرف چل پڑے۔ ہفتہ وار "چٹان" کے دفتر کے باہر رحمان ساتھی سے ملاقات ہو گئی۔ یہ دُبلا پتلا پُرجوش لڑکا کرنال کا رہنے والا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم میں افریقہ کا محاذ دیکھ چکا تھا۔ ان دنوں چٹان میں کام کر رہا تھا۔ اس نے مجھے افریقہ کے محاذ کی ایک کہانی سنائی تھی جس پر میں نے "پھول گرتے رہے" افسانہ لکھا۔ یہ ایک ایسے ہندوستانی فوجی نوجوان کی کہانی تھی جو اٹلی کے کنسنٹریشن کیمپ سے فرار ہو کر ایک اطالوی خاندان کے ہاں پناہ لیتا ہے۔ رحمان ساتھی ہمیں لے کر لاہور ہوٹل کے سامنے والے ٹی سٹال پر آ گیا۔ فٹ پاتھ پر کرسیاں بچھی تھیں۔ ہم یہاں بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ رحمان ساتھی ابن انشا کی طویل نظم 'بغداد کی ایک رات' کی تعریف کر رہا تھا۔

"انشا صاحب! آپ کی نظم میں مشرق کی روایتی رومانویت بھی ہے اور محنت کشوں کی انقلابی جدوجہد بھی۔"

رحمان ساتھی نے مجھے جیب سے ایک خط نکال کر دکھایا جو پشاور سے اُسے ایک لڑکی نے لکھا تھا۔ خط بڑا محبت بھرا تھا۔ رحمان ساتھی نے خط میرے ہاتھ سے لے کر دوبارہ تہہ کر کے جیب میں رکھا اور قہقہہ لگا کر بولا۔

"ویسے میں اس لڑکی سے شادی کر رہا ہوں۔"

رحمان ساتھی کی اس لڑکی سے شادی ہو گئی۔ وہ پشاور کے اخبار روزنامہ "شہباز" کے عملۂ ادارت سے منسلک ہو گیا۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ کچھ عرصہ ٹی بی کے مرض میں مبتلا رہ کر جوانی میں ہی چل بسا۔ خدا مغفرت کرے۔ آج بھی یاد آتا ہے تو اس کی موہنی صورت آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ "پھول گرتے ہیں" میرا افسانہ میری کتاب "کچھ یادیں، کچھ آنسو" میں محفوظ ہے۔ جب کبھی اتفاق سے اس افسانے کو دیکھتا ہوں تو رحمان ساتھی کی یاد آ جاتی ہے کیسے کیسے پھول اپنی ٹہنیوں سے ٹوٹ کر خاک میں مل گئے۔

ایک روز کافی ہاؤس کے باہر ایک صاحب مل گئے۔ نام ان کا بھول گیا ہوں۔ شکل یاد ہے۔ سیاہ چشمہ، چھریرا سانولا بدن۔ ہیرس کی ٹویڈ کا انگلش کوٹ، بادامی سابر کا بوٹ اور تیکھے نقوش۔ ابن انشا۔ ان صاحب سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اُن کے کوٹ پر گردن کے قریب ایک بال چپکا ہوا ہے۔ میں بال کو ہٹانے لگا تو جلدی سے بولے۔

"اونہوں۔ اسے یہیں رہنے دیں۔ جذباتی ایسوسی ایشن۔"

آج کل ان صاحب کو میں کبھی کبھی مال روڈ پر دیکھتا ہوں۔ اُن کے سر پر ایک بھی جذباتی ایسوسی ایشن باقی نہیں رہی۔

شہر کے اندر ہمارے ایک رشتہ دار کی شادی تھی۔ میں نے ابن انشا سے کہا کہ چلو تمہیں لاہور کی ایک بارات دکھاتا ہوں۔ ہم ٹی ہاؤس سے اُٹھ کر اندرونِ شہر آ گئے۔ شادی والے گھر میں بڑی رونق تھی۔ گلی میں چھڑکاؤ کر کے مکان کی دیوار کے ساتھ کرسیاں لگا دی گئی تھیں۔ سُرخ و سپید چہروں والے شہر لاہور کے پرانے کشمیری بوسکیاں پہنے شالیں کندھوں پر ڈالے پان چباتے ہوئے کریون اے کے سگریٹ پھونک رہے تھے۔ میرے کلکتے والے بہنوئی بھی آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے ابن انشا کا تعارف کرایا۔ انھوں نے

کریون اے کی ڈبی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں، تم سگریٹ پیتے ہو۔"

پھر انھوں نے گلی میں بیٹھے بیٹھے اُدپر کھڑکی کی طرف منہ اُٹھا کر اونچی آواز میں کہا۔

"اوئے سلطان! اماں سے کہو چائے کا سماوار نیچے ہی بھیج دے۔"

چچا کو باتیں کرتا دیکھ کر دوسرے رشتے دار بھی اُن کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ کیونکہ چچا بڑی دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ گول مٹول لال سُرخ چہرہ، بھاری بدن بوسکی کی قمیض، سونے کے بٹن، شلوار اور سیاہ فلکیس کا پمپ شو — کریون اے کا کش لگا کر بولے۔

"تم نے کوچہ رنگریزاں کے خواجہ سعد اللہ کو تو دیکھا ہی ہوگا۔ اُن کے پاس ایک گھوڑا رہ گیا تھا جسے وہ فروخت کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے پاس رتھیں تانگہ تھا مگر گھوڑا نہیں تھا۔ سوچا چلو خواجہ کا گھوڑا خرید لیتے ہیں۔ میں نے ایاس رفوگر کو ساتھ لیا اور ہیرلوں والے احاطے میں آگیا۔ یہاں دیکھا کہ ایک گھوڑا بیری کے درخت کے نیچے کھڑا ہے۔ دُور سے یوں لگا جیسے گھوڑے کا ایکس رے کھڑا ہے۔ قریب گئے تو دیکھا کہ ایک رسی گھوڑے کی کمر کے گرد ڈال کر اوپر بیری کی شاخ سے باندھ رکھی ہے۔ پوچھا کہ بھئی یہ رسی کس کے لیے باندھ رکھی ہے؟ کہنے لگے کہ جناب اگر رسی کھول دیں تو گھوڑا گر پڑے گا۔ بہر حال گھوڑے کی قیمت پر بات شروع ہوگئی۔ خواجہ کے آدمی نے ایک رقم لگائی۔ میں نے کم کرنے کو کہا۔ وہ نہ مانے۔ کچھ میں نے رقم بڑھادی۔ کچھ انھوں نے کم کردی آخر ایک روپے بارہ آنے پر سودا ہوگیا۔ ہم نے گھوڑا خرید لیا۔ کھولنے لگے تو خواجہ کے آدمی نے منع کیا اور کہا۔ میری مانیں اور

اپنا رتھیں تانگہ اسی جگہ لے آئیں۔ کیونکہ خطرہ ہے گھوڑا گر پڑے گا۔ تو جناب ہم تانگہ لے آئے۔ اُسے گھوڑے کے پیچھے لے جا کر گھوڑے کو کس دیا۔ خواجے کے آدمی نے لاٹن کلیر پاکر اوپر بیری کی شاخ سے رسی کھول دی۔ اس کا کھلنا تھا کہ گھوڑے نے ایک جھرجھری لی۔ سکا نپا۔ لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ اُسے ریڑھے پر ڈال کر گھر لے آئے رات کو گھوڑے نے دم توڑ دیا۔ ہم نے اُسے گلی کے باہر ڈال دیا امرتسر کمیٹی والے آئے۔ انھوں نے میرا چالان کر دیا۔ ایک روپے بارہ آنے میں گھوڑا تھا۔ میونسپل کمیٹی والوں نے پچاس روپے جرمانہ کر دیا.....۔"

لوگ چچا کی باتوں کا مزہ لے رہے تھے۔ ابن انشاء بھی اُن کی باتوں اور اندازِ گفتگو سے بے حد لُطف اندوز ہو رہا تھا چچا اپنے ایک شکار کا واقعہ بیان کر رہے تھے۔

"امرتسر کی بجلی والی نہر کے پار بڑا جنگل ہوا کرتا تھا۔ ایک بار کچھ دوستوں کے ساتھ سکولوں والے ٹاتروں کی موٹر میں بیٹھ کر تیتر کے شکار کو گئے۔ موٹر ہم نے نہر کنارے کھڑی کر دی اور جھاڑیوں میں اِدھر اُدھر بندوقیں لیے پھیل گئے۔ میرے پاس بھی ایک بندوق تھی۔ میں نے ایک تیتر دیکھا۔ جلدی سے جُھک کر گھٹنوں کے بل آگے بڑھنے لگا۔ تیتر پھڑ پھڑا کر ایک جھاڑی میں داخل ہوا تو میں جناب دھائیں سے بندوق چلادی۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ بندوق کا فائر میں نے ایک ہی کیا تھا مگر آوازیں دو آئیں۔ پہلی آواز بندوق کے فائر کی دھائیں اور ساتھ ہی دوسری آواز آتی تھاہ! میں بڑا حیران ہوا۔ یا میرے مولا! یہ دوسری آواز کہاں سے آگئی۔ میں نے سوچا یہ دوسری آواز کسی دوست کی بندوق

کی ہوگی۔ لیکن جب شکار سے فارغ ہو کر نہر کنارے آئے تو معلوم ہوا کہ دوسری آواز ہماری موٹر کے پچھلے ٹائر کی تھی......"

ابھی مجلس گرم تھی کہ برات تیار ہو گئی۔ لاہور کا مشہور سوہنی بینڈ آ گیا۔ سوہنی نے کلارنٹ منہ سے لگا کر جو بھیرویں کی تان اُڑائی تو زندہ دلانِ لاہور اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ابن انشا، میرے چچا کے دلچسپ اندازِ بیان سے بہت متاثر ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"اس شخص میں دلّی کے پرانے داستان گوؤں کی خوشبو ہے۔"

دولہا میاں گھوڑی پر بیٹھ دُلہن کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ آگے آگے سوہنی کا بینڈ تھا۔ خدا غریقِ رحمت کرے ماسٹر سوہنی کو۔ امرتسر کے عالمگیر مرحوم کے بعد کلارنٹ بجانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ بجانے کو وہ فلمی دھن بجاتا مگر بیچ بیچ میں ایسی تان لیتا کہ لوگ عش عش کر اُٹھتے۔ دولہا کے ساتھ کم اور اس کے ارد گرد زیادہ باراتی ہوتے۔ ہر چوراہے میں لوگ اُسے روک لیتے اور جی بھر کر راگ سنتے۔ ماسٹر سوہنی کے بارے میں ایک کہانی مشہور تھی کہ ایک بارات کو لے کر نکلا تو کسی چوک میں ترنگ میں آ کر کلارنٹ کا فن دکھانا شروع کر دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ بارات دلہن کے گھر جا پہنچی مگر ماسٹر سوہنی ابھی تک چوک میں اپنے بینڈ کے ساتھ کھڑا کلارنٹ بجا رہا تھا۔ چچا بھی بارات کے ساتھ تھا۔ اور بڑھ چڑھ کر ماسٹر سوہنی کو ویلیں دے رہا تھا۔ اُسے راگ داری کی قطعاً سوجھ بوجھ نہ تھی لیکن ظاہر یہی کرتا کہ اس نے بڑے بڑے کلاونتوں کو بھری محفل میں ٹوکا ہے کہ میاں یہ کون سا سُر لگا رہے ہو؟ بارات ڈبی بازار کے چوک میں پہنچی تو چچا نے دس روپے کا نوٹ ایک لڑکے کے ہاتھ بھجوا کر ماسٹر سوہنی کو کہلوایا کہ میاں بھیرویں سناؤ۔ ہم تو راگ بھیرویں سُننا چاہتے ہیں۔ ماسٹر سوہنی نے کلارنٹ ہونٹوں سے ہٹا کر بُرا سا منہ بنا کر اس لڑکے کے کان میں کچھ کہا۔ لڑکے نے چچا کو آ کر بتایا۔

"ماسٹر جی کہتے ہیں کہ میں بھیرویں ہی بجا رہا ہوں۔"

ہر چوک میں دُلہا کے دوست بارات روک کر دُلہا کو دودھ کا پیالہ پلاتے۔ دلہا دو گھونٹ پی کر دودھ باقی شہ بالا کو دے دیتا۔ شہ بالا بھی ایک آدھ گھونٹ چکھ کر پیالہ واپس کر دیتا۔ ابن انشا نے میرے کان میں کہا۔

"اس بارات میں سب سے زیادہ خوش قسمت شہ بالا میاں ہیں شادی کی ساری رسومات پوری کر رہے ہیں مگر شادی کی مصیبتوں سے بچے ہوئے ہیں۔"

ایک جگہ دلہا کو روک کر دودھ پلانے لگے تو میں نے تنگ آ کر کہا کہ یہ کم بخت اسے اتنا زیادہ دودھ کس لیے پلا رہے ہیں؟

"یہ ایک طرح سے اُسے حوصلہ دے رہے ہیں کہ میاں حوصلہ رکھو اور آگے بڑھتے جاؤ۔"

اس سے مجھے یاد آ گیا کہ ہمارے امرتسر شہر میں ایک صاحب گھریلو پریشانیوں کی وجہ سے دیوانے ہو گئے۔ اب ان کا کام یہ تھا کہ مخبوط الحواس ہو کر وہ بازاروں گلیوں میں پھرا کرتے۔ جہاں کہیں کوئی بارات دیکھتے بھاگ کر دُولہا کے پاس جاتے اور بلند آواز سے فرماتے۔

"میاں اب بھی وقت ہے۔ بھاگ جاؤ۔"

لباس کے معاملے میں ابن انشا زیادہ حساس نہیں تھا۔ جیسا مل جاتا پہن لیتا۔ گرمیوں میں ٹھنڈی پتلون اور بشرٹ اور سردیوں میں عام طور پر میل خورے رنگ کا گرم سوٹ پہنتا۔ کوہی نیشن میں نے اُسے بہت کم پہنتے دیکھا ہے۔ ہاں اس کے پاس ٹویڈ کا چھوٹے خانوں والا سُرخی مائل کوٹ ہوا کرتا تھا جسے اُس نے خوب پہنا۔ اس معاملے میں ہم لوگ یعنی میں، انور جلال، نواز، حبیب احمد آف فلم سنتہ فہیم صلاح الدین ستو، رشید اور ڈاکٹر ضیا۔ بہت محتاط تھے اور ہماری ٹولی پاک ٹی ہاؤس، کافی ہاؤس بلکہ مال روڈ کی خوش لباس ٹولی مشہور تھی۔ کشمیری ہونے کے ناطے ہمارے گھر میں کشمیری شالوں کا عام رواج تھا۔ ایک بار میں نے ایک پُرانی میرون کلر کی شال کو کٹوا کر قمیض بنوائی تو انور جلال اُسے دیکھتا رہ گیا۔

"ونڈر فل آئیڈیا ہے حمید —— ایسی گرم قمیض کہیں نہیں مل سکتی۔"

اب ان لوگوں نے بھی اپنے اپنے گھروں میں شالیں تلاش کرنی شروع کر دیں۔ ہفتے بعد انور جلال، ستو، حبیب اور ڈاکٹر ضیا۔ بھی پشمینے کی رنگ برنگ قمیضوں میں ملبوس تھے۔ دو گھوڑا بوسکی کی قمیض ان دنوں آسانی سے بن جایا کرتی تھی۔ آج کل تو دو گھوڑے بوسکی کی ایک قمیض نمتی ہے۔ انار کلی میں جرمن

کارڈورے اور اطالوی بوسکی بھی مل جاتی تھی۔ موسم بہار میں گولڈن کارڈورے کے کوٹ ہم لوگ بڑے شوق سے پہنتے تھے۔ اگر خبر ملتی کہ لنڈے بازار میں کینیڈا کی سویڈ کی کوئی جیکٹ آئی ہے تو وہاں بھی پہنچ جاتے۔

ایک روز میں نے ابن انشا سے کہا کہ انار کلی میرے ساتھ چلو۔ بوسکی خریدنی ہے۔ مجھے میرے ناول "جنگل روتے ہیں" کے کافی پیسے مل گئے تھے۔ کہنے لگا۔

"کپڑوں کا شوق بڑا بورژوائی شوق ہے، میرا کہا مانو اور اس وقت کے لیے پیسے بچا کر رکھو جب تمہارے پاس مجھے چائے پلانے کے لیے دونی بھی نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا۔

"میں تمہیں انار کلی میں آم کا جوس پلاؤں گا۔"

ہنس کر بولا۔

"اب میں تمہارا دل نہیں توڑ سکتا۔ ویسے اگر اس شوق میں آم کا جوس شامل ہو جائے تو اتنا بُرا بھی نہیں ہے۔"

ہم انار کلی پہنچ کر کپڑے کی ایک دکان میں گھس گئے۔ میں نے بوسکی خریدی۔ ابن انشا۔ نے بھی دو قمیضوں کا کپڑا خریدا۔ نیلے چیک کا ڈیزائن بڑا خوشنما تھا۔ ہم نے ایک ساتھ ڈائمنڈ ٹیلرز کو سینے کے لیے دے دیں۔ واپسی پر آم کا جوس پیا۔ ٹی ہاؤس آئے تو اشفاق احمد سے ملاقات ہو گئی۔ ہم ان کی تصویریں دیکھنے نمبر ایک مزنگ روڈ والے مکان پر آ گئے۔ اوپر والے کمرے میں اس نے اپنا سٹوڈیو بنا رکھا تھا۔ ایزل پر ایک کینوس غیر مکمل پڑا تھا۔ آئل کلر کی کوئی نیم تجریدی تصویر بنی تھی۔ بعد میں اشفاق احمد نے یہی تصویر ممتاز مفتی کی کتاب "اسمارائیں" کے ٹائیٹل کے لیے دے دی۔ بڑا گرم کمرہ تھا۔ کتابیں کچھ شیلفوں میں اور زیادہ میزوں پر ڈھیر پڑی تھیں۔

باہر نکل کر چوک رینگل کی طرف آئے تو انور جلال کے گھر چلے گئے۔ وہ بھی اوپر

والے کمرے میں ایک تصویر بنا رہا تھا۔ خالص تجریدی آرٹ تھا۔ ابن انشاء نے اپنے خاص انداز میں کچھ فقرے چُست کیے جو مجھے یاد نہیں رہے۔ انور جلال کے قہقہے سے کمرہ ایک بار تو ہل گیا۔ یہاں سے نکل کر ہم تینوں کافی ہاؤس کے برابر والے چائنیز لنچ ہوم میں آگئے۔ آگے استاد امانت علی خاں اپنی محفل سجاتے بیٹھا تھا۔ سرخ و سپید خوبصورت موسیقار بڑا پیارا لگ رہا تھا۔ چائے کا دَور ایک بار پھر چلا۔ لطیفے بازی شروع ہو گئی۔ پاک ٹی ہاؤس سے پیغام آیا کہ شہرت بخاری بلا رہا ہے۔ ہم ٹی ہاؤس آگئے۔ شہرت بخاری نے اپنی چمکیلی آنکھیں جھپکا کر کہا۔

"یار تمہیں کل حلقے میں افسانہ پڑھنا ہے۔ یاد ہے نا؟"

"ہاں بھئی یاد ہے۔"

"لکھ لیا ہے نا افسانہ؟"

ابن انشاء جھٹ بول پڑا۔

"اس کا کیا ہے کسی بھی افسانے کا شروع اور آخر بدل کر پڑھ دے گا۔ اس کے سارے افسانے ایک جیسے ہوتے ہیں۔"

میں نے انشاء کی کمر میں زور سے مکّا رسید کیا۔

"تم بھی تو ایک ہی غزل سال بھر سے مشاعرے میں سنا رہے ہو۔"

ابن انشاء زیادہ تر نظمیں لکھا کرتا تھا۔ غزل شاید ہی کبھی ہوتی تھی ویسے بھی اس کی غزل مجھے متاثر نہ کرتی تھی۔ خدا غریق رحمت کرے ہمارے یار امانت علی خاں نے اس کی غزل "انشاء جی اُٹھو اب کوچ کرو" ایسی گائی کہ انشاء کی دھوم مچ گئی۔ تب مجھے بھی معلوم ہوا کہ ابن انشاء تو سچ مچ بڑی اچھی غزل کہتا ہے۔ شعر سنانے کے معاملے میں بھی انشاء بڑا شرمیلا تھا۔ محمود جیلانی گورنمنٹ کالج لاہور کے ہوسٹل میں رہتا تھا۔ ایک روز میں، ابن انشاء اور استاد امانت علی خاں اس کے کمرے میں گئے۔ محمود جیلانی

بڑا ہنس مکھ، متواضع اور زندہ دل لڑکا تھا۔ ——— اس کے کمرے میں ہی ہم نے کیتلی میں چائے بنائی۔ محمود کہیں سے ہارمونیم اٹھا لیا۔ اس پر گرد جمی ہوئی تھی۔ امانت علی خان نے رومال سے ہارمونیم صاف کیا اور انشاء سے کہا۔

"انشاء صاحب! اپنی کوئی غزل سنایئے۔ میں اس کی ابھی طرز بنا دوں گا۔"

ابن انشاء شرما سا گیا۔ کہنے لگا۔

"پھر کسی وقت سہی۔"

جب ہم نے بہت زور دیا تو انشاء نے ایک غزل سنائی جو بڑی غیر معروف سی غزل تھی اور لمبی بحر میں تھی۔ امانت نے اسی وقت غزل کی طرز تیار کر دی اور گا کر سنائی۔ ہارمونیم بے سُرا تھا۔ طبلہ بھی نہیں تھا لیکن امانت کی آواز نے وہاں سماں باندھ دیا۔ محمود جیلانی کے ہوسٹل سے نکلے تو پاک ٹی ہاؤس میں آکر دوستوں میں بیٹھ گئے۔

انہی دنوں سردیوں کے موسم میں ایک لڑکی نے مجھے ٹیلی فون کرنا شروع کر دیا۔ میرے لیے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ویسے بھی میں ایک لڑکی سے محبت کر رہا تھا اور وہاں شادی کی بات چیت شروع ہونے والی تھی۔ میں نے کوئی خاص پرواز کی۔ لڑکی کا فون آتا۔ میں ادھر اُدھر کی دو ایک باتیں کر کے فون بند کر دیتا۔ یہ ٹیلی فون پاک ٹی ہاؤس میں آتے تھے۔ ٹی ہاؤس کا منیجر ہمارا دوست علیم الدین تھا۔ چائے اور شعر و ادب کا رسیا تھا۔ ایسی چائے بناتا کہ محسوس ہوتا دارجلنگ کے چائے کے باغ میں بیٹھ کر چائے پی رہے ہیں۔ ایک روز اس لڑکی کا فون آیا تو علیم الدین کہنے لگا۔

"یہ کیا نیا چکر چلا رہے ہو؟ ریحانہ کو کیا منہ دکھاؤ گے؟"

میں نے کہا۔

"خدا کی قسم کوئی چکر نہیں ہے۔ میں نے اس لڑکی کو کئی بار منع کیا ہے کہ بی بی مجھے ٹیلی فون نہ کیا کرو۔ میں شادی کرنے والا ہوں۔ مگر وہ باز ہی نہیں آتی۔ اب میں کیا کروں؟"

جب کبھی میں اس لڑکی کا فون سن کر واپس میز پر آتا تو ابن انشاء مجھے دھمکاتا کہ باز آجاؤ۔ نہیں تو میں ریحانہ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب فون آیا تو اسے صاف صاف کہہ دوں گا کہ بی بی آئندہ سے مجھے فون نہ کرنا۔ اتفاق سے تھوڑی دیر بعد پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ غیر شعوری طور پر میری نگاہیں کاؤنٹر کی طرف اٹھ گئیں۔ علیم الدین ریسیور کاؤنٹر پر رکھ کر میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ میں اٹھ کر گیا۔ دوسری طرف وہی لڑکی بول رہی تھی۔

"ہیلو!"

میں نے اسے فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا کہ اب مجھے کبھی فون نہ کرنا۔ وہ بڑے آزردہ لہجے میں بولی۔

"میں آخری فون کرنے سے پہلے صرف ایک بار آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"ملنا ہے تو یہاں پاک ٹی ہاؤس آجاؤ۔ مل لوں گا۔"

کہنے لگی۔

"جی نہیں۔ میں ایک مشہور آدمی کی بیٹی ہوں۔ پردہ بھی نہیں کرتی۔ اس لیے آپ سے باہر کہیں نہیں مل سکتی۔"

"تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں بی بی؟"

اب اس [illegible]ی نے اچانک ایک ایسا چیلنج کر دیا کہ جسے قبول نہ کرنا میری مردانگی کے [illegible]ف تھا۔ چھوٹتے ہی کہنے لگی۔

"کیا آپ دیوار پھاند سکتے ہیں؟"

اب آپ ہی بتائیں کہ میں اُسے کیا جواب دیتا؟ امرتسر کے ایک نوجوان سے اگر کوئی لڑکی یہ کہے کہ دیوار پھاند کر مل سکتے ہو تو وہ مر جائے گا لیکن یہ کبھی نہیں کہے گا کہ نہیں بی بی! میں دیوار نہیں پھاند سکتا۔ میں نے کہہ دیا۔

"ضرور پھاند سکتا ہوں۔"

لڑکی کہنے لگی۔

"تو پھر آج رات بارہ بجے ہماری کوٹھی کی عقبی دیوار پھاند کر آجائیں میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں گی۔"

ایک بار تو میں بھی سناٹے میں آگیا۔ ایک دم سے ریحانہ کا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ پھر پولیس کی سیٹیوں کی آواز سنائی دی۔ پکڑ لو۔ پکڑ لو۔ چور۔ چور۔ پھر حوالات — بدنامی — قید — بے عزتی — لیکن اندر چھپے ہوئے امرتسری نے کہا۔ بزدل نہ بنو۔ لڑکی کیا کہے گی کہ ڈر گیا۔ لگا دو چھلانگ — اور میں نے چھلانگ لگا دی۔ میں نے فون پر ہی کوٹھی کا سارا حدود اربعہ سمجھ لیا اور کہا۔

"میں آج رات بارہ بجے آؤں گا۔"

کہنے کو تو میں نے کہہ دیا لیکن کسی گہری سوچ میں گم واپس ابن انشاء کے پاس آیا۔ وہ چائے بنا رہا تھا۔

"باز آجاؤ سالے! میری بھی بدنامی کرواؤ گے تم۔"

جب میں نے اُسے بتایا کہ میں آدھی رات کو دیوار پھاند کر اس لڑکی سے ملنے جا رہا ہوں تو اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"میں تھانے جا کر تمہاری ضمانت نہیں کروا سکتا۔ تم جانو اور تمہارا کام۔"

ابن انشاء نے مجھے بہت سمجھایا کہ میں اس خطرناک ارادے سے باز آجاؤں، لیکن میں اُسے یہی کہتا رہا کہ یہ میری مردانگی کی توہین ہے کہ میں اب بھاگ جاؤں۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں انشاء اللہ اس لڑکی کو جاکر صرف سمجھاؤں گا اور بس۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔ تم کہاں کے شیخ سعدی ہو کہ آدھی رات کو لڑکی کے گھر کی دیوار پھاند کر اُسے نصیحتیں کرنے جا رہے ہو؟ اور اگر کسی نے چور سمجھ کر پکڑ لیا۔ اس لڑکی کے گھر والے جاگ پڑے تو پھر کیا ہوگا۔ اخباروں میں خبر لگ جائے گی۔ ریحانہ کا کیا حال ہوگا۔ ساری زندگی اس سے تمہاری شادی نہ ہو سکے گی کمینے! باز آجاؤ۔"

مگر میں فیصلہ کر چکا تھا۔ دن میں جاکر میں کوٹھی کا محل وقوع دیکھ آیا۔ جس دیوار کو مجھے پھاندنا تھا، وہ ڈیڑھ مرد اونچی تھی اور اوپر سے عشق پیچاں کی بیل سے ڈھکی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے باہر لڑکی کے باپ کا نام لکھا تھا۔ واقعی مشہور آدمی تھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ اگر واقعی پکڑا گیا تو کیا ہوگا؟ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہوں گا۔ سارے خاندان کی بدنامی ہوگی۔ کیا جانے کہ لڑکی بھی کہہ دے کہ مجھے کیا معلوم یہ کون ہے؟ کیا جانے پکڑے جانے کے بعد وہ خود بھی چور چور کا شور مچا دے۔ طرح طرح کے خیال، وسوسے اور اندیشے دل میں آرہے تھے، لیکن میدان سے بھاگ جانے کی بے عزتی بھی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ خاص طور پر جب ایک لڑکی نے چیلنج کیا ہو۔ میرا خدا جانتا ہے کہ میرا دل بالکل پاک اور صاف تھا۔ کیوں پاک صاف تھا؟ یہ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ ہو سکتا ہے اس میں ریحانہ کی محبت کا دخل ہو۔ ہو سکتا ہے اس میں کچھ اثر درختوں اور پھولوں سے پیار کرنے کا ہو۔ بہرحال اس لڑکی کے بارے میں میرے دل میں

کوئی بُرا خیال نہیں تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ اللہ کی جانب سے تھا۔

میں نے ابن انشاء کو تیار کرنا شروع کر دیا کہ رات کو وہ بھی میرے ساتھ چلے۔ وہ تو سخت غصے میں آگیا۔

"میں تمہیں جانے سے روک رہا ہوں اور تم مجھے بھی اس مصیبت میں گھسیٹ رہے ہو۔"

میں نے اُسے بتایا کہ کوٹھی کی دیوار ڈیڑھ مرد اونچی ہے اور اس کی مدد کے بغیر میں اُسے نہ پھاند سکوں گا۔

"اچھا تو تم مجھے بطور سیڑھی اپنے ساتھ لے جا رہے ہو۔ میرا دماغ نہیں خراب جو تمہارے ساتھ چل دوں۔"

مگر میں نے اُسے منا ہی لیا۔

شام تک ہم پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھے رہے۔ شام کو اس لڑکی کا پھر ٹیلی فون آیا۔ وہ تصدیق کرنا چاہتی تھی کہ میں رات کو آرہا ہوں؟ میں نے کہا۔

"ایک بار کہہ دیا ہے کہ آؤں گا۔ دوبارہ فون نہ کرنا۔"

اس رات سردی بھی بہت تھی۔ پاک ٹی ہاؤس سے نکل کر ہم مال پر کچھ دیر ٹہلتے رہے پھر کھانا کھایا۔ رات کے دس بج گئے۔ اب ہم اس کوٹھی کے قریب ہی اپنے ایک دوست کے ہوسٹل میں آگئے۔ چائے بنا بنا کر پیتے رہے۔ جب رات نے پونے بارہ بجائے تو میں نے آنکھ سے ابن انشاء کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے اپنے دوست سے اجازت لی اور سڑک پر آگئے۔ سڑک سنسان تھی۔ سردی زوروں پر تھی۔ ابن انشاء کہنے لگا۔

"کمینے! اب بھی وقت ہے۔ باز آجا۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور لڑکی کے گھر کی طرف چل پڑا۔ پولیس لائنز کے قریب سے گزرتے ہوئے ابن انشاء بولا۔

"مجھے تو خوف آ رہا ہے۔"

میں نے کہا۔

"ڈر مجھے بھی لگ رہا ہے انشا۔ مگر مجبوری ہے۔ جانا ہی پڑے گا۔"

"سالے تو عاشقوں کا ٹارزن کس لیے بن رہا ہے؟ یہ تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ تمہیں دیوار پر چڑھا کر میں وہاں سے رفوچکر ہو جاؤں گا۔؟"

"بے شک چلے جانا۔"

سڑک ایک ٹیوب ویل کی عمارت کے عقب میں آ گئی۔ یہاں سٹریٹ لیمپ روشن تھے۔ سامنے وہ کوٹھی تھی جس کی عقبی دیوار مجھے پھاندنی تھی۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات کے پورے بارہ بج رہے تھے۔ سخت سردی اور گہری خاموشی تھی۔ میں آگے آگے تھا۔ ابن انشا میرے پیچھے پیچھے تھا۔ ہم جھک کر چوروں کی طرح چل رہے تھے۔ کوٹھی کی عقبی دیوار آ گئی۔ عشق پیچاں کی بیل اندھیرے میں دیوار کے اوپر کالے لحاف کی طرح پڑی تھی۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔

"دیوار کے پاس چلو۔"

ابن انشا نے سرگوشی کی۔

"وہ کم بخت آئی بھی ہے کہ نہیں۔"

"شی! چل کر دیکھتا ہوں۔"

ہم دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ عزت اور ذلت میں بس ایک دیوار حائل تھی، لیکن میں بھاگ نہیں سکتا تھا۔ میں نے انشا سے کہا۔

"دیوار کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارے کندھوں پہ پاؤں رکھوں گا پھر تم کھڑے ہو جانا۔"

ابن انشا نے دبی زبان میں گالی دی اور دیوار کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے کندھوں پر ایک پاؤں رکھا۔ دیوار کا سہارا لیا۔ پھر دوسرا پاؤں رکھا اور اسے کہا کہ کھڑے ہو جاؤ۔ وہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔ میرا ہاتھ عشق پیچاں کی بیل پر پڑ گیا۔ میں نے ایک ٹانگ دیوار کے اوپر ڈال دی۔ ابن انشا نیچے سے کھسک گیا۔ میں نے دیکھا۔ وہ اندھیرے میں اپنی عینک ٹھیک کر رہا تھا۔ پھر منہ اوپر کر کے آہستہ سے بولا۔

"میں جا رہا ہوں۔"

اور وہ میرے دیکھتے دیکھتے اندھیرے میں گم ہو گیا۔ میں نے دوسری ٹانگ بھی دیوار پر عشق پیچاں کی بیلوں میں کر لی اور کچھ دیر بالکل ساکت و جامد ہو کر دیوار پر اوندھے منہ لیٹا رہا۔ اتنے میں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے سر بیل کی شاخوں میں کر لیا۔ تین کانسٹیبل گھوڑوں پر سوار گشت لگاتے ہوئے سڑک پر سے گزر گئے۔ میں نے دل میں دعا مانگی کہ یا اللہ! ابن انشا خیریت سے نکل گیا ہو۔ وہ نکل چکا تھا۔ گھڑ سوار کانسٹیبل جب دور نکل گئے تو میں نے دیوار کے دوسری طرف جھانکا۔ یہ کوٹھی کا تنگ سا عقبی آنگن تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ برآمدے میں چقیں گری تھیں۔ دیوار کے ساتھ ہی امرود کا ایک درخت اگا تھا۔ لڑکی وہاں نہیں تھی، لیکن امرود کے درخت کے نیچے ایک چھوٹی سی موم بتی روشن تھی۔

یہ اس لڑکی کی طرف سے اشارہ تھا کہ میں جاگ رہی ہوں۔

امرود کے پیڑ تلے آدھی رات کو موم بتی روشن دیکھ کر مجھے امرتسر کا قبرستان یاد آ گیا۔ میں چپ چاپ دم سادھے دیوار کے اوپر عشق پیچاں کی بیل میں لیٹا رہا۔ اب مجھے سردی نہیں لگ رہی تھی۔ اتنے میں برآمدے کی چق ایک طرف سے ذرا سی ہٹی اور اندھیرے میں مجھے ایک دبلی پتلی سی لڑکی کا سایہ اپنی طرف بڑھتا نظر آیا۔ دیوار کے قریب آ کر اس نے منہ اوپر اٹھا کر دیکھا۔ میں نے ہاتھ

بلا کر اُسے بتایا کہ میں آ گیا ہوں۔ اس وقت مجھے اپنے آپ پر دورِ شجاعت کے بہادر نائٹوں کا گمان ہو رہا تھا جو آدھی رات کو پرانے قلعوں کی دیواریں پھاند کر اپنی محبوباؤں سے ملنے جایا کرتے تھے۔ لڑکی نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے نیچے اترنے کو کہا۔ اس نے پہلے ہی دیوار میں ایک لمبا کیل ٹھونک رکھا تھا تاکہ میں اس پہ پاؤں رکھ کر اطمینان سے نیچے اتر سکوں۔ میں اس لڑکی کی چالاکی پر بڑا حیران ہوا۔

میں کوٹھی کے آنگن میں کود گیا۔ لڑکی نے موم بتی پھونک مار کر بجھا دی۔ اس کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی مجھے اس وقت وہ ایک ایسی احمق ہرنی معلوم ہوئی جس نے انجانے بن میں کسی شیر کو اپنے گھر جانے پر بلا لیا ہو۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ میں بھوکا نہیں تھا، لیکن اس لڑکی کے بیباک قدم اٹھانے میں کوئی جھجک نہیں تھا۔ میں سوچنے لگا۔ اس نوعمر کنواری لڑکی کے ماں باپ اندر گرم لحافوں میں دبکے سو رہے ہیں۔ انھیں کوئی خبر نہیں کہ ان کے خاندان کی عزت تنی ہوئی رسی پر کھڑی ڈگمگا رہی ہے۔ کیسے ماں باپ ہیں یہ! پھر مجھے خیال آیا۔ ہو سکتا ہے ان کے ذہن میں عزت کا معیار یہ نہ ہو۔ مگر ایسا ہو نہیں سکتا۔ بہر حال وہ لڑکی میرے سامنے بیٹھی تھی۔ میں اس کے پاس کمبل پہ بیٹھا تھا جو اس نے پہلے ہی بچھا رکھا تھا اور ہمارے اوپر خدا ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اس وقت مجھے احساس نہیں تھا کہ خدا ہمیں دیکھ رہا ہے۔ یہ مجھے آج خیال آتا ہے۔ اس وقت مجھے جس چیز کا احساس تھا وہ امرود کا درخت تھا جس کی گھنی شاخوں میں سے آدھی رات کے اندھیرے میں پکے امرودوں کی مہک آ رہی تھی اور مجھے گالزوردی کا "سیب کا درخت" یاد آ رہا تھا۔ وفا شعار کم سخن دیہاتی لڑکی میگن یاد آ رہی تھی جس کی لاش ایک روز سیب کے درخت کے نیچے تالاب میں پڑی تھی اور اس پر سیب کے شگوفے اپنی ٹہنیوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ گلابی شگوفے! سفید شگوفے۔

واپسی پر ابن انشا نہیں تھا، چنانچہ مجھے اکیلے ہی ڈیڑھ مرد اونچی دیوار سے چھلانگ لگانی پڑی۔ میں پنجوں کے بل گرا۔ اور میرا سر زمین سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ رات ڈھل رہی تھی اور سخت سردی میں سڑک سنسان تھی۔ میں نے اس لڑکی کو بہت سمجھایا تھا اور منع کیا تھا کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرے۔ لیکن دو روز بعد مجھے پھر وہی دیوار پھاندنی پڑی۔ لڑکی نے فون پر کہا تھا کہ اگر میں اسے آدھی رات کو ملنے نہ گیا تو وہ زہر کھا کر مر جائے گی۔ اس رات سیڑھی کا کام ایک اور شاعر نے دیا۔ لڑکی میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس رات بھی لڑکی کے کپڑوں سے پہلی رات والے عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ آج بھی عطر کی وہ خاص خوشبو مجھے اس رات کی یاد دلاتی ہے۔ قصہ مختصر میں نے لڑکی کو آخری بار سمجھایا اور کہا کہ میں اب کبھی نہیں آؤں گا۔ وہ لڑکی مجھ سے ناراض ہو گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ میں اسے سمجھاتا رہا تھا کہ اسے اپنے ماں باپ کی عزت کا خیال کرنا چاہیے۔ وہ ایک شریف خاندان کی بچی ہے اور اس قسم کی باتیں اسے زیب نہیں دیتیں۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ یہ کہیں کہ مجھے بھی یہ باتیں زیب نہیں دیتی تھیں کہ آدھی رات کو دیوار پھاند کر ایک لڑکی کو نصیحتیں کرنے بیٹھ جاؤں۔ ہو سکتا ہے میرے اس فعل کو بزدلی، نفسیاتی پس ماندگی، جنسی انفعالیت یا خدا جانے کس کس نفسیاتی اصطلاح سے تعبیر کیا جائے۔ لیکن میں ہر حالت میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میرے ہاتھوں ایک شریف خاندان کی عزت تباہ ہونے سے بچ گئی۔ ہم جب چاہیں ایک اڑتی پھرتی رنگین تتلی کو چھڑی سے مار کر ہلاک کر سکتے ہیں۔ ہمیں اس کا اختیار دیا گیا ہے۔ مگر ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

کچھ عرصہ گزرا لاہور کے فلیٹی ہوٹل میں فیض احمد فیض کی سالگرہ کی تقریب پر میں نے اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ کھڑی کسی سہیلی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ مجھ سے ناراض تھی۔ میں

جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے کیوں ناراض تھی۔ مگر خدا کی قسم میں ایک لاکھ ایک مرتبہ اس لڑکی کی ناراضگی مول لینے کو تیار ہوں۔ لیکن ایک مرتبہ بھی ایسا کام کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا جو اس لڑکی کی عزت برباد کر دے۔ ایک وقت آئیگا جب اُسے محسوس ہوگا کہ میں نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا ٹھیک کیا تھا اور اُسے مجھ سے ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ یہ وقت وہ ہوگا جب اس کی اپنی بچی جوان ہوگی یا اس کی بچی کی بچی جوان ہوگی یا اُس کے بیٹے کی بہو گھر آئے گی۔ پھر اُسے اس حقیقت کا احساس ہوگا کہ ایک عورت سے خاندان کی عزتیں کس طرح وابستہ ہوتی ہیں اور ایک لڑکی آدھی رات کو کسی غیر محرم کو اپنے گھر کی دیوار پھاندنے کی دعوت دے کر کتنی بھیانک غلطی کا ارتکاب کرتی ہے۔

کیونکہ ہر دیوار پھاندنے والا میرے ایسا بے وقوف نہیں ہوتا۔

کراچی پہنچ کر شروع شروع میں انشاء کو کافی جدو جہد کرنی پڑی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا گیا۔ وہ "پاک سرزمین" کا ایڈیٹر بنا تو مجھے اس نے پرچے میں لکھنے کے لیے کہا۔ میں نے اُسے دو تین مزاحیہ مضمون بھیجے۔ یہ سرکاری رسالہ تھا اور اس کا دفتر صدر میں کیفے ٹیریا کے پیچھے ایک گلی میں تھا۔ احمد بشیر بھی ابن انشاء کے ساتھ ہی اس رسالے میں تھا۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری اس رسالے کے چیف ایڈیٹر اور نگرانِ اعلیٰ تھے۔ ابن انشاء اور احمد بشیر نے "پاک سرزمین" پر بڑی محنت کی اور اسے بہترین پرچہ بنا دیا۔ میں ایک بار کراچی گیا تو ابن انشاء اور احمد بشیر سے "پاک سرزمین" کے دفتر میں روزانہ ہی ملنے جاتا۔ ان دنوں احمد بشیر، ابن انشاء کا بہترین ساتھی تھا اور دونوں زندگی کی بہتر منزلوں کی طرف رواں تھے۔

کراچی میں قدرت اللہ شہاب صاحب کے نیک مشورے اور قیمتی صحبت بھی ابن انشاء کو قدم قدم پر میسر رہی۔ کراچی میں ایک دفعہ ہمیں ادیبوں کے دستخطوں کی مہم درپیش تھی۔ میں اور اشفاق احمد لاہور سے اس مقصد کے لیے

کراچی گئے۔ یہ لاہور کے ایک ادیب کی زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ اس مہم میں ابن انشاء، عباس احمد عباسی اور جمیل الدین عالی نے بھرپور حصہ لیا اور ان لوگوں نے نہ دن دیکھا نہ رات ہمارے ساتھ ساتھ لگے رہتے، گھر گھر گھوم کر کراچی کے ادیبوں اور صحافیوں سے دستخط کرواتے۔ قدرت اللہ شہاب انسانی ہمدردی اور محبت و خلوص کی بلندیوں پر نظر آ رہے تھے۔ اُن کے باتھ آئی لینڈ کراچی والے گھر میں، ابن انشاء، میں اور اشفاق احمد دن میں ایک بار ضرور ملاقات کرتے۔ شہاب صاحب کی محبت، خلوص اور مہمان نوازی ساری زندگی یاد رہے گی۔ ہمیں دمشق سے آیا ہوا عراقی کھجوروں کا مربہ اور بہترین مکھن کھلاتے اور خود چائے میں رس ڈبو کر کھاتے۔ شہاب صاحب ابن انشاء سے بے حد محبت کرتے تھے اور اس کا احترام بھی بہت کرتے تھے۔ اس کی ہر بات کو بڑی توجہ سے سنتے اور اکثر معاملات میں ابن انشاء سے مشورہ کر لیا کرتے۔ انشاء بڑا صائب الرائے، ذہین اور ذمہ دار دوست تھا۔ سوائے معاملاتِ محبت کے وہ دنیا کے ہر مسئلے پر بڑا مناسب مشورہ دے سکتا تھا۔ میری کم بختی دیکھئے کہ میں نے زندگی میں سوائے معاملاتِ محبت کے دوسرے کسی مسئلے پر اس سے کبھی مشورہ نہ لیا۔

میں اور انشاء ایک روز دستخطوں کی مہم کے سلسلے میں ہی "جنگ" اخبار کے دفتر گئے۔ وہاں ابراہیم جلیس اور شفیع عقیل ملے۔ دوسرے احباب سے بھی ملاقات ہوئی۔ ابراہیم جلیس بازو پھیلا کر میری طرف بڑھا۔

"اوئے کمینیا! تو آ گیا؟"

شفیع عقیل میں وہی لاہور والی گرمجوشی، محبت اور خلوص تھا۔ افسانہ نگار انور جوش صاحب، شوکت تھانوی، قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، احمد علی صاحب اور کراچی کے ادیب، شاعر اور صحافی بھائی بہنوں نے دستخطوں کی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ہم لوگ اپنی مہم میں کامیاب ہو گئے۔ قدرت اللہ شہاب،

ابن انشاء، اشفاق احمد اور عالی صاحب کو خاص طور پر بڑی خوشی ہوئی۔ یہ ایک انسانی ہمدردی کا کام تھا جس میں ہم لوگ خدا کے فضل و کرم سے سرخ رو ہوئے۔ میں اپنے دوستوں کا آج بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے انتہائی خلوص اور محبت کا ثبوت دیا۔ نہ دن دیکھا نہ رات اور میرے ساتھ ساتھ شہر کی سڑکوں پر پھرتے رہے۔

اللہ تعالیٰ اُنھیں جزائے خیر دے۔ آمین!

○

صدر ایوب خان پاک جمہوریت ٹرین میں مشرقی پاکستان کے دورے پر چلے تو اپنے ساتھ شاعروں اور ادیبوں کی ایک جماعت لے جانے کا بھی فیصلہ کیا۔ اس جماعت میں میرا نام بھی تھا۔ میرے علاوہ ابوالاثر حفیظ جالندھری، جمیل الدین عالی، ابراہیم جلیس اور ابن انشا بھی تھے۔ ابن انشاء نے کراچی سے مجھے فون کیا۔

"ڈھاکہ جانے کے لیے تیاری کر لو۔"

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ میں سارے مشرقی پاکستان کی سیر کروں گا۔ کرنا فلی اور پدما دریاؤں کی سیر کروں گا۔ سندر بن میں آدھی رات کو شیروں کی دھاڑ سنوں گا اور خلیج بنگال کے پانیوں کو کاکس بازار کے ساحل کو چومتے دیکھوں گا۔ جنوب مشرقی ایشیا کی مرطوب ہواؤں کی ناریل کے جھنڈوں میں سرگوشیاں سنوں گا۔ اور سلہٹ کی ڈھلانوں پر چائے کے باغات دیکھوں گا۔ بنگال کا جادو۔ لمبے سیاہ بال اور جوڑوں میں لگے تمناری کے سفید شگوفے۔ جادو بھری باتیں کرتیں سیاہ آنکھیں۔ خواب آلود سانولے چہرے اور سمندر کی طرف سے آتی ہواؤں میں جھومتے ناریل کے جھنڈ اور کرنا فلی کے مانجھیوں کے درد بھرے گیت —— میں بچپن ہی سے بنگال کے جادو کے اثر میں ہوں۔ کلکتے جاتے ہوئے جب گاڑی آسنسول پہنچتی تو بنگال شروع ہو جاتا اور میں کھلی آنکھوں سے تالابوں میں کھلے ہوئے کنول پھول اور دھوپ میں چمکتے

ناریل کے درخت اور سنبل کی ٹہنیوں پر کھلے سُرخ پھول اور گھاٹ پہ پانی بھرتی عورتوں اور پگڈنڈیوں پر بھاگتے بچوں کو دیکھا کرتا۔ جب پاکستان بنا تو مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی تھی کہ بنگال کا ایک حصہ ہمارے پاس آ گیا ہے اور ناریل، کنول کے پھولوں اور جوڑوں میں سجے ترناری کے سفید شگوفوں سے میرا رشتہ ٹوٹا نہیں، لیکن ہوائی سفر اتنا مہنگا تھا کہ ناریل کی خوشبو کبھی لاہور تک نہ پہنچ سکتی تھی، چنانچہ جب مجھے ابن انشاء کی زبانی معلوم ہوا کہ میں بھی مشرقی پاکستان جا رہا ہوں تو میں نے ناریل کی ٹھنڈی چھاؤں میں ایک سانولی لڑکی کو سمندر کی طرف جاتے دیکھا۔ اور اس کے جوڑے میں لگے سفید پھولوں کی خوشبو میرے قریب سے ہو کر گزر گئی۔

پاک ٹی ہاؤس کی گیلری میں جمیل الدین عالی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ لاہور سے کراچی جانا ہو گا۔ جہاں سے سُپر کانسٹی لیشن ہمیں آدھی رات کے بعد ڈھاکہ روانہ ہو جائے گا۔ ابو الاثر حفیظ جالندھری کراچی پہنچ گئے تھے۔ ابن انشاء اور ابراہیم جلیس پہلے ہی کراچی میں تھے۔ میں ریل گاڑی میں بیٹھ کر کراچی گیا۔ سیدھا ابن انشاء سے جا کر ملا۔ وہ بھی تیاری میں لگا تھا۔ رات کو ہم ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔ ابراہیم جلیس اور حفیظ صاحب اور قدرت اللہ شہاب صاحب سے ملاقات ہوئی۔ لاؤنج میں بیٹھ کر ہم نے چائے پی۔ جنوری کا مہینہ تھا۔ کراچی میں خنکی تھی۔ ابن انشاء نے گرم سوٹ پہن رکھا تھا۔ شہاب صاحب نے کہا۔

"ڈھاکہ پہنچ کر یہ سوٹ اتارنا پڑے گا انشاء جی! وہاں اتنی سردی نہیں ہو گی۔ بس خوشگوار موسم ہو گا۔"

ابن انشاء بھی پہلی بار ڈھاکہ جا رہا تھا۔ جمیل الدین عالی بار بار کہہ رہا تھا۔

"اے حمید مشرقی پاکستان میں اتنی گرینری (سبزہ) ہے کہ تم دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے۔"

ابراہیم جلیس بولا۔

"دیکھنے تم لنکا اور سیلون کو بھول جاؤ گے۔ کیا بور کیا ہے تم نے لنکا اور سیلون کی گرینری بیان کر کے۔"

ابن انشاء نے کہا۔

"اب یہ مشرقی پاکستان کے بارے میں لکھ لکھ کر ہمیں پاگل کر دے گا۔"

جلیس نے کہا۔

"اے حمید کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جاؤ۔ ارے تمہیں جہاز میں بڑے چکر آئیں گے۔ آؤ تمہیں برانڈی پلاؤں۔"

میں نے کہا۔

توبہ توبہ۔ خدا وہ دن نہ لائے کہ میں برانڈی کو ہاتھ لگاؤں کیسے! کیا دنیا میں سکاچ ختم ہو گئی ہے؟"

شہاب صاحب نے بتایا کہ جہاز میں میری سیٹ حفیظ صاحب کے ساتھ ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی اور خوشی کی وجہ سے مجھ پر رعشہ طاری ہو گیا۔ ابن انشاء میری خوشی سے اتری ہوئی صورت دیکھ کر ہنس پڑا۔ میں نے کہا۔

"میں کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھنا زیادہ پسند کروں گا۔"

ابن انشاء جھٹ بولا۔

"لیکن تم چھلانگ تو لگا نہیں سکو گے۔ پھر کھڑکی کے پاس بیٹھنے کا فائدہ کیا؟"

میں نے کہا۔

"کم از کم میں آسمان پر چمکتے ستارے تو دیکھ سکوں گا۔"

ابن انشاء ہنس کر بولا۔

"حفیظ صاحب تمہیں دیکھنے دیں گے تو دیکھ سکو گے۔"

آدھی رات کے بعد جہاز نے کراچی سے ٹیک آف کیا۔ روشنیوں میں جگمگاتے کراچی کے اوپر ایک "چکر" لگایا اور ڈھاکے کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابن انشاء مجھ سے ایک سیٹ چھوڑ کر پیچھے بیٹھا تھا۔ حفیظ صاحب مجھ سے ہمیشہ کی طرح بڑی

شفقت سے پیش آئے۔ پہلے انہوں نے مجھے مشرقی پاکستان کا حدود اربعہ بتایا پھر وہاں کے لوگوں کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ اس دوران میں نے دو ایک بار گول شیشے میں سے باہر آسمان پر چمکتے ستاروں کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن مصیبت یہ تھی کہ شیشے میں بھی مجھے اپنا اور حفیظ صاحب کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے گردن گھما کر ابن انشاء کی کسی بات کا جواب دینا چاہا تو حفیظ صاحب نے میرے ہاتھ میں ایک مٹھائی تھما کر کہا۔

"یہ لو کھاؤ۔ اس شریر کی بات کا جواب نہ دو۔ اور ہاں۔ میں تمہیں بتا رہا تھا کہ مشرقی پاکستان کا جنگل سندربن سب سے بڑا جنگل ہے....."

جہاز جانے کس وقت میرے شہر امرتسر کے اوپر سے گزر گیا۔ میں اس کی ایک بھی روشنی نہ دیکھ سکا۔ میں تو حفیظ صاحب کے ساتھ سندربن کے جنگل میں شیر کا شکار کھیل رہا تھا۔ جہاز کے اندر اعلان ہوا کہ اب ہمارا جہاز دلی کے اوپر سے گزر رہا ہے۔

غالب میر مومن اور داغ کی دلی کے اوپر سے گزر رہا ہے۔ اس وقت ابراہیم جلیس ہماری سیٹ کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اس نے جھک کر میری سیٹ کے شیشے میں سے نیچے دیکھا اور بولا۔

"اے حمید باہر دیکھو۔ ایسے لگ رہا ہے جیسے کسی نے جھلملاتے ستاروں کا ڈھیر لگا دیا ہے۔"

میں نے نیچے دیکھا۔ روشنیوں کا ایک ڈھیر دکھائی دے رہا تھا۔ حفیظ صاحب نے بھی میری گردن کے اوپر سے نیچے دیکھا اور پھر انہوں نے پرانی دہلی اور نئی دلی کی پرانی اور نئی یادوں کی دلچسپ باتیں شروع کر دیں۔ وہ کبھی بلی ماراں سے نکلتے اور دریبے میں گھس جاتے۔ وہاں سے نکلتے تو تیس ہزاری سے ہوتے ہوئے تیمار پور مولانا چراغ حسن حسرت کے گھر پہنچ جاتے۔ مجھے وہ اپنے ساتھ ساتھ لئے پھر رہے تھے اور

ہمارا سپر کانسٹی لیشن بنگال کی فضاؤں میں داخل ہو چکا تھا۔ جہاز نے مشرقی پاکستان کا رخ کیا اور حفیظ صاحب چاندنی چوک میں ٹل والے ہندو مٹھائی فروش کی برتی کی تعریفیں کر رہے تھے۔

"مٹھائی بنانا تو کوئی دلی والوں سے سیکھے۔ کہتے ہیں ٹل والے کی مٹھائی شاہی قلعے میں ہر ماہ منوں کے حساب سے جایا کرتی تھی۔

ایک بار نواب وزیر الدولہ کے ہاں شادی تھی، راوی لکھتا ہے کہ....."

جہاز نے ایک لمبا چکر کاٹا اور ڈھاکہ ایئرپورٹ پر جھکتا چلا گیا۔ ڈھاکہ کے ہوائی اڈے کا محل وقوع کچھ اس قسم کا تھا کہ ہوائی جہاز کو بڑا پیچیدہ سا چکر لگا کر نیچے اترنا پڑتا تھا۔ جہاز نے مشرقی پاکستان کی سرزمین کو چھوا تو میں حفیظ صاحب کے ساتھ ابھی چاندنی چوک کے ٹل والوں کی دکان پر بیٹھا تھا۔ جہاز ایئرپورٹ کی عمارت کے سامنے جا کر رک گیا۔ رات کے تین یا شاید چار بجے تھے۔ میں ٹل والوں کی دکان سے حفیظ صاحب کے ساتھ ہی اٹھا اور جہاز کے دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ بنگال کی خوشبو سب سے الگ تھی۔ پو پھٹ رہی تھی۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ ہلکی ہلکی سلیٹی رنگ کی ٹھنڈی روشنی میں دور ناریلوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ ایئرپورٹ کی عمارت نے مجھے متاثر نہ کیا۔ ابن انشاء اور جلیس بھی میرے ساتھ سیڑھیاں اترے۔ انشاء میری طرف دیکھ کر شرارت کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ حفیظ صاحب میرے ساتھ تھے۔ ہم لاؤنج میں آ گئے۔ ہمارا سامان پل بھر میں کلیر کر کے ہمارے حوالے کر دیا گیا۔

ایک گاڑی میں بیٹھ کر ہم ایئرپورٹ سے نیو مارکیٹ کے پاس والے ایم پی اے ہوسٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ حالی نے کہا تھا، مشرقی پاکستان میں گرسبزی ہی گرسبزی ہے۔ میں اور ابن انشاء آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گرسبزی یعنی سبزہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گاڑی کھوکھا نما دکانوں اور پرانی دو منزلہ عمارتوں کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ میں نے حالی سے پوچھا۔

"بھائی وہ گریسزی کہاں ہے؟"

عالی نے کہا

"میاں ذرا ایئرپورٹ سے باہر تو نکلنے دو"

ابنِ انشاء نے باہر دیکھ کر کہا:

"ابھی تک تو ایسا لگ رہا ہے کہ لدھیانے شہر سے گزر رہے ہیں۔"

ابراہیم جلیس نے زوردار قہقہہ لگا کر کہا۔

"اوئے تو کمینہ ہے لدھیانے دے بدمعاش!"

ابنِ انشاء نے کہا۔

"بھئی عالی صاحب! وہ گریسزی کہاں ہے آپ کی؟"

"میاں! ذرا روشنی تو ہونے دو"

دن کا اجالا پھوٹنے سے پہلے پہلے ہمیں ایم پی اے ہوسٹل پہنچا دیا گیا۔ نیو مارکیٹ کے سامنے یہ ایک لمبے لمبے برآمدوں والی ایک منزلہ عمارت تھی۔ جس میں ایک کے ساتھ ایک کمرے جڑے ہوئے تھے۔ مجھے جلیس اور انشاء کو ایک کمرہ دے دیا گیا۔ اس میں لکڑی کے تختوں والے تین پلنگ پڑے تھے۔ جن پر مچھردانیاں لگی تھیں۔ کمرے میں گرمی تھی۔ ہم نے مچھردانیاں لپیٹ دیں اور پلنگ پر لیٹ گئے۔ خیال تھا گھنٹہ بھر آرام کریں گے، لیکن جہاں ہم تینوں جمع ہو جائیں وہاں آرام کہاں۔ جلیس نے لطیفے سنانے شروع کر دیے۔ ہم پلنگ پر بیٹھ گئے۔ پلنگ بڑے کمزور سے تھے۔ ہم تھوڑا سا ہلتے اور وہ زیادہ ہلتے تھے۔ تختے بھی بڑے نحیف و نزار تھے۔ جلیس نے کوئی لطیفہ سنایا۔ میں قہقہہ لگا کر اچھلا تو میرے پلنگ کا تختہ ٹوٹ گیا اور میں تختے کے ساتھ ہی فرش پر گر پڑا۔ اس پر ابراہیم جلیس نے فلک شگاف قہقہہ لگایا تو اس کا پلنگ بھی ٹوٹ گیا اور وہ بھی دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔ ابنِ انشاء بڑے مزے سے بیٹھا ہماری بے بسی پر ہنس رہا تھا۔ ہم دونوں اٹھ کر اس کے پلنگ پر آ گئے اور زور زور سے اچھلنے لگے۔ زیادہ اچھلنے کی نوبت ہی نہ آئی اور انشاء بھی ہمارے ساتھ

دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔

"حرام زادو! ہمارے بارے میں یہاں کے لوگ کیا سوچیں گے؟"

ہنسی کے مارے جلیس کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔ کہنے لگا۔

"انہوں نے ہمیں یہ الوانٹی کھٹوانٹی پلنگ کیا سوچ کر دیے تھے کمینے؟"

میں نے کہا۔

"چلو عالی صاحب کو جگاتے ہیں کہ ہمارے لیے کسی دوسرے کمرے کا بندوبست کیا جائے۔"

ہم کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئے۔ اب جو عالی صاحب کے کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا تو وہ بھی ٹوٹے ہوئے پلنگ پر نیم دراز ایک کتاب پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ انہوں نے پلنگ کو اطلاع دینے سے پہلے کہیں کروٹ بدل لی تھی۔

"بھئی! کسی طرح یہ وقت گزار لو۔ دن چڑھے گا تو سب بندوبست ہو جائے گا۔"

بہرحال تھوڑی دیر بعد پلنگ تبدیل کر دیے گئے۔ اب کوئی لطیفہ ہوتا تو ہم قہقہہ لگانے سے پہلے پلنگ سے نیچے اتر آتے تھے۔ دن چڑھ آیا۔ سورج کی روشنی باہر لان میں کھلے استوائی پھولوں پر چمکنے لگی۔ کیاریوں میں ویسے ہی پھول کھل رہے تھے جیسے پھول میں کلکتے کے باغوں میں دیکھا کرتا تھا۔ اگر کوئی فرق تھا تو محض اتنا کہ یہ پھول غریب اور ان پڑھ سے لگ رہے تھے۔ صبح کی روشنی میں پہلی بار ارد گرد کی عمارتوں کو دیکھا۔ ایک بلڈنگ کی گیلریوں میں کپڑے سوکھنے کو ڈال رکھے تھے۔ ایک ساڑھی والی سانولی عورت گملے کو پانی دے رہی تھی۔ ہوا کا جھونکا آیا اور اس میں تلے ہوئے انڈوں کی خوشبو تھی۔ لان کے مغربی کنارے ناریل کے دو درخت صبح کی ہوا میں جھوم رہے تھے۔ ذرا پرے ایک بڑا سا تالاب تھا جس کے ساتھ کچھ جھونپڑیاں دور تک چلی گئی تھیں۔ اس تالاب کی جانب سے جو ہوا

رہی تھی اس میں مچھلی کی بو تھی۔ گھاس شبنم سے گیلی ہو رہی تھی۔ میں نے دو تین لمبے لمبے سانس لیے اور کمرے میں آ گیا۔ ابراہیم جلیس منہ ہاتھ دھونے غسل خانے میں گیا تھا۔ اور انشاء پلنگ پر بیٹھا شیو بنا رہا تھا۔

"کیوں بھئی کوئی گرینری نظر آئی؟"

میں نے کہا۔

"گرینری ہے مگر کچھ بیمار بیمار سی ہے۔"

انشاء بولا۔

"مجھے تو ابھی تک یہی محسوس ہو رہا ہے کہ لدھیانے میں آ گیا ہوں۔ یہاں وہ بنگال کا جادو — وہ چشم بنگال کہاں ہے؟"

جلیس تولیے سے منہ رگڑتا ہوا اندر آ کر بولا۔

"یار یہاں کے پانی میں تیل کی آمیزش معلوم ہوتی ہے۔"

انشاء بولا۔

"ابھی انہوں نے اس میں سے تیل نہیں نکالا۔"

انشا خوب رگڑ رگڑ کر شیو بنا رہا تھا۔ میں نے اس میں ایک عجیب بات دیکھی تھی کہ وہ دن میں دو بار شیو کرتا تھا۔ یعنی پہلی شیو صبح اٹھ کر کرتا اور دوسری شیو شام کو بناتا۔ میں نے اُسے ایک بار کہا تھا۔

"تم مہینے میں ساٹھ بار شیو کرتے ہو۔ اس اعتبار سے تم شیواجی ہو۔"

ہم نہا دھو کر کپڑے بدل رہے تھے کہ ایک بنگالی نوکر اندر آیا۔ اور بولا۔

"صاحب کوئلے آؤں کوئلہ؟"

پہلے تو ہم نے ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھا۔ پھر اس بنگالی نوکر کا منہ تکنے لگے کہ یہ کوئلہ کس لیے لانا چاہتا ہے؟ ابن انشاء کہنے لگا۔

"یار یہ لوگ بڑے مہمان نواز ہیں اور ہمیں دانت مانجھنے کے لیے کوئلہ مہیا کرنا چاہتے ہیں۔"

جلیس کہنے لگا۔

"مگر ہم تو ٹوتھ پیسٹ سے دانت صاف کر چکے ہیں۔"

ابن انشاء نے کہا۔

"کچھ بھی ہو۔ پروٹوکول کا یہی تقاضا ہے کہ ایک بار پھر کوئلہ کر لیا جائے۔"

چنانچہ اُس نے نوکر سے کہہ دیا کہ کوئلے لے آئے۔ تھوڑی دیر بعد بنگالی نوکر زرد کیلوں کا ایک گچھا اٹھائے آیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ہمیں بنگال کا کیلا کھلانا چاہتا تھا۔ کیلا بڑا میٹھا اور قد آور تھا۔ دیکھتے دیکھتے ہم سارے کیلے کھا گئے۔ اس کے بعد ناشتا کیا اور جمیل الدین عالی ہمیں ساتھ لے کر شہاب صاحب کے ہاں آ گئے۔ شہاب صاحب کوٹھی کی ایک عالیشان کوٹھی کے برآمدے میں گاؤن پہنے بانس کی آرام کرسی پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے۔ خیر خیریت پوچھی۔

"ناشتا کر لیا آپ لوگوں نے؟"

جلیس ہنس کر بولا۔

"جی ہاں! ہم نے کوئلوں کا ناشتا کیا ہے۔"

"کوئلوں کا ناشتا؟"

ابن انشاء نے جب بنگالی نوکر کا لطیفہ سنایا تو شہاب صاحب بہت محظوظ ہوئے۔ کوٹھی کے وسیع و عریض لان میں ناریل اور چھالیہ کے درخت قطار میں کھڑے تھے اور کیاریوں میں رجنی گندھا کے سفید پھول مسکرا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ پاک جمہوریت ٹرین شام کو ڈھاکہ کے کملا پور ریلوے سٹیشن سے روانہ ہو گی اور کچھ روز تک سارے مشرقی پاکستان میں گھومتی پھرے گی۔ ہم نے شہاب صاحب کے ساتھ کافی کا ایک ایک کپ پیا۔ اگلے پروگرام کے بارے میں ہمیں بتایا گیا اور ہم واپس ہوٹل میں آ گئے۔ دوپہر کا کھانا کھایا اور سو گئے۔ تیسرے پہر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ حفیظ صاحب اندر تشریف لے آئے۔ بڑی شفقت سے بولے۔

"برخوردارو! اپنے پیارے مشرقی پاکستان آ گئے ہو۔ کیا یہاں سو کر وقت

ضائع کر دو گے۔ چلو میرے ساتھ تمہیں بوڑھی گنگا دریا کی سیر کراؤں۔"

ابن انشاء نے کہا۔

"حفیظ صاحب! جو گنگا بوڑھی ہو چکی ہے اُس کی سیر دیکھنے سے کیا فائدہ بھلا۔"

حفیظ صاحب مسکراتے ہوئے انشاء کے پلنگ پر بیٹھ گئے۔ انشاء جلدی سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ حفیظ صاحب تعجب سے بولے۔

"کیا میں کوئی اچھوت ہوں جو تم مجھ سے ڈر کر بھاگ گئے ہو؟"

جلیس نے کہا۔

"یہ بات نہیں ہے حفیظ صاحب! دراصل یہ پلنگ دو عظیم شاعروں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔"

ابراہیم جلیس نے یہ کہہ کر سیر کو چلنے سے انکار کر دیا کہ اُسے اپنے ایک رشتہ دار سے ملنے جانا ہے۔

ابن انشاء کوئی معقول عذر پیش نہ کر سکا اور میں حفیظ صاحب کے ساتھ سیر کا لطف اٹھانا چاہتا تھا، کیونکہ یہ میری اُن کے ساتھ پہلی سیر تھی۔ حفیظ صاحب ہمیں ایم پی اے ہوسٹل سے پیدل ہی لے کر بوڑھی گنگا کی طرف روانہ ہو گئے۔ سڑکوں پر بڑی رونق تھی۔ موٹر رکشا، سائیکل رکشا، بس اور کاریں آ جا رہی تھیں۔ ایک جگہ پہنچ کر ہم تھک گئے۔ کہا کہ ٹیکسی کروا لیتے ہیں۔ حفیظ صاحب اولئے دلبری کے ساتھ مسکرائے۔ اپنے سینے پہ انگلی مار کر کہا۔

"میری طرف دیکھو۔ اس عمر میں بھی ذرا سانس نہیں پھولا۔ اوئے تم کہاں کے جوان ہو؟"

مجھے حفیظ صاحب کا گیت یاد آ گیا۔ ابھی تو میں جوان ہوں۔ واقعی وہ ابھی تک جوان تھے۔ بلا مبالغہ ہم نے آدھا ڈھاکہ پیدل پھر لیا تھا لیکن اُن کے چہرے پہ ذرا تھکن کے اثرات نہیں تھے۔ ہم دوبارہ فٹ پاتھ پر چل پڑے۔ حفیظ صاحب

آگے آگے تھے۔ ہم دونوں اُن کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ابن انشاء نے میرے کان کے قریب آ کر کہا۔

"کمبخت! تو نے مجھے بھی مروا دیا ہے۔"

ایک دکان کے باہر لکھا تھا "نیشنل ساڑھی ہاؤس"۔ حفیظ صاحب ذرا آگے جا کر فٹ پاتھ پر اچانک رُک گئے۔ وہ پلٹ کر واپس ہوئے اور بورڈ کو دیکھا، مسکرائے۔ پھر انگلی سے اشارہ کر کے بولے۔

"نیشنل ساڑھی۔ یعنی اپنی پاکستانی ساڑھی۔"

ہمیں لے کر وہ دکان میں گھس گئے۔ ہمارے کالروں پر پاک جمہوریت ٹرین کے بیج لگے تھے۔ دکان کے سیلز ایجنٹوں نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ بوتلیں منگوائیں۔ حفیظ صاحب صوفے پر تشریف رکھے ہوئے تھے۔ سیلز ایجنٹوں نے مختلف قسم کی ساڑھیاں دکھانی شروع کر دیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بے حد قیمتی اور خوبصورت ریشمی ساڑھیاں تھیں۔ انہوں نے ہمارے سامنے ساڑھیوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ حفیظ صاحب بار بار انگلی کھڑی کر کے کہتے۔ وہ دکھائیے۔ یہ دکھائیے اور ہر ساڑھی کو دیکھ کر وہ بڑے فخر سے گردن تان کر کہتے۔

"نیشنل! پاکستانی! پاکستانی! نیشنل!"

میں اور ابن انشاء بڑے مزے سے بیٹھے بوتل پی رہے تھے اور تھکن اتار رہے تھے۔ دکاندار کا خیال تھا کہ ہم مغربی پاکستان سے آئے ہیں۔ ایک آدھ ساڑھی تو ضرور خریدیں گے۔ پھر انہوں نے آدھی دکان ہمارے آگے الٹ دی تھی، لیکن حفیظ صاحب ہمیں ساتھ لے کر اٹھے اور نیشنل! پاکستانی! پاکستانی! نیشنل! کی گردان کرتے دکان سے باہر آ گئے۔ اب ہم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ پلٹ کر دکان دار کو منہ دکھاتے۔

حفیظ صاحب کو پاکستان اور پاکستانی قومی مصنوعات سے جو والہانہ محبت ہے اس میں تو کسی کو شک ہو ہی نہیں سکتا، لیکن دکان دار آخر دکاندار ہوتا ہے۔ بہر حال ہم فٹ پاتھ پر ایک بار پھر روانہ ہو گئے۔ کچھ ہی دور چلیں ہوں گے کہ

اچانک حفیظ صاحب ایک بار پھر کھڑے ہو گئے۔ پلٹ کر اوپر دیکھا۔ ہم بھی رُک گئے اور پلٹ کر اوپر دیکھا۔ ایک جنرل مرچنٹ کی دکان کے باہر بانس کی کھونٹی پر ایک خاکی رنگ کا فوجی سویٹر لٹک رہا تھا۔ حفیظ صاحب نے شہادت کی انگلی سویٹر کی طرف اٹھائی۔ ہم دکان والے سے بوتلیں پینے کے لیے ایک بار پھر تیار ہو گئے۔

"اس خاکی جرسی کو دیکھ رہے ہو انشا؟"

"جی ہاں دیکھ رہا ہوں۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہی ہے۔"

"یہ میرے ملازم کو بالکل فٹ آئے گی۔"

میں بڑا متاثر ہوا کہ حفیظ صاحب کو ہزاروں میل دور آ کر بھی اپنے نوکر کا کس قدر خیال ہے۔

"چلو! دکاندار کے پاس چل کر اس کی قیمت معلوم کرتے ہیں۔"

بھولے بھالے دکاندار نے ہمیں اپنی دکان کی طرف آتے دیکھا تو بڑا خوش ہوا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ مغربی پاکستان سے سیاح آئے ہیں بہت کچھ خریدیں گے۔ بے چارے نے اسی وقت بوتلیں منگوائیں۔ کرسیاں خالی کروا دیں۔ حفیظ صاحب نے کہا کہ ہمارے پیارے پاکستان کی بنی ہوئی چیزیں دکھاؤ۔ اس نے بڑی بڑی قیمتی چیزیں ہمارے سامنے کاؤنٹر پر ڈھیر کر دیں۔ ان میں شیشے کے ایش ٹرے، بانس کے مکان، کشتیاں بجرے، گلدان اور خدا جانے کیا کیا تھا۔ ہم تو کرسیوں پر بیٹھے ٹھنڈی بوتلیں پی رہے تھے اور اپنی تھکان اتار رہے تھے۔ ابن انشا تھوڑی دیر بعد میرے کان میں کچھ کھسر پھسر کرتا اور پھر ہم دونوں دوسری طرف منہ کر کے ہنسنے لگتے۔ حفیظ صاحب نے آخر میں باہر بانس کی کھونٹی پر لٹکی ہوئی میلی سی پرانی خاکی جرسی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔

"اس کی کیا قیمت ہو گی؟"

دکاندار کچھ چپ سا ہو گیا۔ پھر بولا۔

"صاحب! یہ والا جرسی تو کئی سال کا پرانا ہے۔ ادھر بارش میں بھی باہر ہی لٹکا رہتا ہے۔"

حفیظ صاحب مسکرائے۔

"پیارے! تم قیمت تو بتاؤ۔ ہم کو بھی اپنے ایک بڈھو نوکر کے لیے خریدنی ہے۔"

دکاندار نے جرسی کی قیمت سوا روپے بتائی۔ آخر بارہ آنے پر سودا طے ہو گیا۔ دکاندار جرسی کو لفافے میں لپیٹنے سے گریز کر رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ لفافہ جرسی سے زیادہ مہنگا تھا۔ بہرحال ہم لوگ جرسی خرید کر آگے روانہ ہوئے۔ میں نے انشا سے کہا کہ حفیظ صاحب کی انسانی ہمدردی سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ بھلا اتنی دور آ کر کون اپنے نوکر کا خیال رکھتا ہے۔ اس کے جواب میں ابن انشا نے میرے کان میں ایک بات کہی۔ میں نے فوراً اس کے کان میں کہا۔

"بکواس کرتے ہو تم۔"

حفیظ صاحب نے پلٹ کر ہماری طرف دیکھا۔

"ارے تم کیسے جوان ہو کہ پیچھے رہ کر چل رہے ہو۔"

پھر فرمایا۔

"کیسی کیسی مہمان داریاں ہو رہی ہیں تمہاری۔ کتنے مخلص لوگ ہیں یہاں کے دکاندار۔ بوتل پلائے بغیر تو جانے ہی نہیں دیتے۔"

اب ہم دریائے بوڑھی گنگا پر پہنچ گئے۔ میں نے بڑے بڑے بوڑھے دریا دیکھے ہیں لیکن بوڑھی گنگا سے زیادہ بوڑھا دریا آج تک نہیں دیکھا۔ ایک میلا کچیلا گندہ سا بوڑھا دریا زمین پر اوندھے منہ پڑا بڑی نقاہت سے رینگ رہا تھا اور اس کے رعشہ زدہ سینے پر پھٹے پرانے بادبانوں والی کشتیاں بڑی مشکل سے چل رہی تھیں۔ کھوکھوں سے بنی ہوئی پر ہجوم مارکیٹ میں قسم قسم کی سبزیوں، مچھلیوں اور باسی پھلوں کی بوجھل بو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک جگہ ہم نے ٹھنڈی داب پی۔ داب والے کو پیسے دینے کے لیے ہم تینوں نے اپنی اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جیب سے پیسے نکالنے

میں ہم سب نے خاصی دیر لگائی، لیکن حفیظ صاحب ہار گئے۔ دام کے پیسے انہوں نے ادا کیے۔ کھوکھا مارکیٹ میں گھومتے ہوئے ہم نے ایک جگہ بڑے تر و تازہ میٹھے کیلے دیکھے۔ حفیظ صاحب نے ایک کیلا اٹھا کر کہا۔

"مشرقی پاکستان کی خاص سوغات کیلا۔"

ہم نے کیلے کھانے شروع کر دیے۔ جب کھا کھا کر تھک گئے تو اپنے اپنے رومال نکال کر منہ پونچھنے بلکہ منہ چھپانے لگے۔ اس بار ہم نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہی نہیں۔ اس لیے کہ جیب میں ہاتھ ڈال کر اس کا باہر نکالنا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ آخر حفیظ صاحب کی شفقت کام آئی۔ یہاں بھی انہوں نے بل ادا کیا۔

ابن انشاء بہت تیز تیز چلنے کا عادی تھا۔ میں اُسے اکثر کہا کرتا۔

"یار تم اپنی چال سے بیمہ کمپنی کے ایجنٹ لگتے ہو۔ بڑی غیر شاعرانہ چال ہے تمہاری۔"

لیکن ڈھاکہ کی سڑکوں پر حفیظ صاحب کے ساتھ پیدل چل چل کر وہ بھی نڈھال ہو گیا۔ اُس کی چال بھی شاعرانہ ہو گئی۔

تیسرے پہر ہم تینوں تیار ہو کر ڈھاکہ کے کملا پور ریلوے سٹیشن پہنچ گئے۔ وہاں مشرقی پاکستان کے شاعر، ادیب اور صحافی حضرات سے ملاقات ہوئی۔ ان میں قوی غلام مصطفٰے، جسیم الدین، فرخ احمد اور وحید قیصر ندوی بھی تھے۔ جسیم الدین کو مشرقی پاکستان کا ابوالاثر حفیظ کہا جاتا تھا۔ بڑے غیر حاضر دماغ اور بھولے بھالے تھے۔ اپنے ڈبے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا ڈبہ تلاش کر رہے تھے۔ میں نے انشاء سے کہا۔

"اس شخص کو ہمارے ساتھ سفر کرنا چاہیے۔"

پاک جمہوریت ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ نئی نکور ریل کار قسم کی لمبی گاڑی تھی جس کا ہر ڈبہ فرسٹ کلاس کا ڈبہ تھا۔ ہم نے چارٹ دیکھا ہمارے ڈبے میں ہم تینوں کے علاوہ ایک ایسے شاعر کا نام بھی تھا جن کے بارے میں مشہور

تھا کہ چلتی گاڑی میں اپنا کلام سنانے کے ماہر ہیں۔ ہمارا رنگ اڑ گیا۔ جلیس نے کہا۔

"یہ شخص تو ہمارا پھڑا کر دے گا۔"

ابن انشاء بولا۔

"فکر نہ کرو۔ میں بھی اُسے اپنا کلام سنانا شروع کر دوں گا۔"

جلیس نے سر پیٹ کر کہا۔

"اس کو تو خیر کسی نہ کسی طرح برداشت کر لیں گے مگر تمہیں کیسے برداشت کریں گے؟"

میں نے کہا۔

"گھبراؤ نہیں دوستو! میں ابھی سارا انتظام کیے دیتا ہوں۔ ذرا میرے ساتھ کمپارٹمنٹ کے پاس تو چلو۔"

ہمارے کمپارٹمنٹ کے باہر ہمارے ناموں کے ساتھ اُس شاعر کی چٹ بھی لگی تھی۔ میں نے اس کی چٹ پیتل کے چھوٹے سے فریم سے نکالی اور اگلے ڈبے میں جا کر ایک کمپارٹمنٹ میں لگا کر وہاں سے قوی غلام مصطفٰے کی چٹ اتار کر لے آیا۔

ابن انشاء نے ہنس کر کہا۔

"یہ تو اور بھی بُرا ہوا۔ پہلے والے شاعر کی کم از کم نظمیں سمجھ میں تو آ جاتیں۔ یہ جو نظمیں سنائے گا، وہ ہماری سمجھ میں ہی نہیں آئیں گی۔"

میں نے چٹ فریم میں پھنسا کر کہا۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم اس شریف آدمی کو بھگت لیں گے۔"

اتنے میں پہلے والے شاعر بقچہ بغل میں دابے آن پہنچے۔ ہمیں کمپارٹمنٹ کے باہر دیکھ کر اُن کی باچھیں کھل گئیں۔

"واللہ! آپ بھی اس ڈبے میں سفر کر رہے ہیں کیا؟ بھئی واہ! خوب مزا رہے گا۔"

وہ اندر گھس رہے تھے کہ میں نے معذرت چاہتے ہوئے انہیں بتایا کہ ٹرین کنڈکٹر نے بعض انتظامی پیچیدگیوں کے باعث ان کی سیٹ آگے کے ڈبے میں بدل دی ہے۔ انہوں نے تعجب کیا اور فرمایا۔

"لیکن چارٹ پر تو میرے ڈبے کا نمبر یہی لکھا ہے۔"

جلیس بولا۔

"قبلہ! وہ تو ٹھیک فرمایا آپ نے لیکن کنڈکٹر صاحب کو کچھ تبدیلیاں کرنا پڑ گئی ہیں۔"

وہ مجسم افسانہ بنا کر بولے۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔ آپ ایسے لوگوں کا ساتھ چھٹ گیا۔"

وہ بقچہ اٹھاتے آگے چل دیئے۔ سامنے سے قوی غلام مصطفےٰ چلے آ رہے تھے۔ قلی نے سامان اٹھا رکھا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے۔

"اپنے کو ادھر مالوم ہوا کہ ادھر کو ڈبہ لگا۔"

ہم نے اوپر والی برتھ پر اُن کا بستر لگوا دیا۔ جمیل الدین عالی دو ڈبے چھوڑ کر ایک چھوٹے کوپے میں براجمان تھے۔ اُن کے ساتھ جسیم الدین سفر کر رہے تھے۔ سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا کہ ٹرین ریلوے سٹیشن سے چل پڑی۔ پہلے شہر کی عمارتیں گزریں۔ پھر جھونپڑیوں کا طویل سلسلہ گزرنے لگا۔ اس کے بعد ہرے بھرے کھیت، ناریل کے جھنڈ اور گھنے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ابن انشاء نے کہا۔

"یار یہ تو سچ مچ گرین ہری ہے۔"

واقعی ڈھاکے سے باہر نکلتے ہی سبزہ شروع ہو گیا تھا۔ لہلہاتے کھیت، گھنے سایہ دار درخت، تالابوں میں کھلے کنول کے سفید پھول اور ڈھلوانی چھتوں پر چڑھتی ہوئی ہری ہری بیلیں ۔۔ ناریل، تاڑ اور چھالیہ کے درخت ریل کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ٹرین میں ڈائننگ کار بھی تھی جس کے کوپن ہمیں دے دیئے گئے تھے

بیڈ ٹی، ناشتہ، دوپہر کا کھانا، شام کی چائے اور رات کے کھانے کے کوپن۔ ہم نے رات کا کھانا۔ ڈائننگ کار میں بیٹھ کر کھایا۔ انیسویں صدی کی کلاسیکی قسم کی خوبصورت ڈائننگ کار تھی۔ جس کی میزوں پر دلکش میز پوش پڑے تھے۔ قوی غلام مصطفےٰ نے بھی ہمارے ساتھ ہی دال بھات کھایا۔ ان کی ایک عادت میری سمجھ میں نہ آئی۔ (ٹوٹی پھوٹی اردو میں) بات کرتے کرتے وہ اچانک بنگلہ زبان میں بولنے لگتے اور دیر تک بولتے چلے جاتے۔ بعد میں انشاء نے مجھے بتایا کہ وہ بنگالی میں اپنی نظمیں سنا رہے ہوتے تھے۔ رات کو انہوں نے اپنی طویل بنگالی نظمیں سنانا شروع کر دیں۔ ابراہیم جلیس تو سنتے سنتے بے ہوش ہو گیا۔ ابن انشاء برتھ پر اوندھا پڑ کر لیٹ رہا۔ میں اکیلا رہ گیا۔ قوی صاحب برابر اپنی نظمیں سنائے جا رہے تھے۔ یہ وہ مقام تھا جب شاعر اپنے سامع سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور وہ در و دیوار کو بھی شعر سنانے لگتا ہے یا یوں سمجھ لیں کہ سامعین اُس کے لیے در و دیوار بن جاتے ہیں۔

آخر شعر سناتے سناتے نقاہت کے مارے وہ خود ہی سو گئے۔ آدھی رات کو انہوں نے ڈکار مارنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہر ڈکار پر وہ خود ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے اور کہتے۔

"یہ دھماکے کی آواز کہاں سے آئی تھی؟"

دوسرے روز ہم نے آپس میں صلاح مشورہ کر کے قوی غلام مصطفےٰ کی سیٹ ایک بار پھر بدل دی۔ اب ہمارے حصے میں قوی جسیم الدین آئے۔ خیال تھا کہ یہ بے ضرر سا سیدھا سادھا شاعر ہے۔ اپنی نظمیں نہیں سنائے گا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بے ضرر ثابت ہوا۔ لیکن اُس نے ایک اور مصیبت ڈال دی۔ چلتی گاڑی میں وہ دونوں ہاتھ باہر نکال کر کھیتوں میں کام کرتے کسانوں کو آوازیں دے دے کر اپنی طرف متوجہ کرتا۔ اور پھر اونچی آواز میں انہیں اپنے شعر سناتا۔ پھر ہماری طرف دیکھ کر انگریزی میں کہتا۔

"یہ میرے لوگ ہیں۔ میں ان کے لیے لکھتا ہوں۔ یہ مجھے جانتے ہیں۔"

میں ان کی آواز ہوں۔"

میں نے ابن انشاء سے کہا۔

"شاعر ہو تو ایسا ہو کہ اس کی زبان ہر کوئی سمجھ سکے: ایک تم شاعر ہو کہ سوائے میرے اور کسی کو شعر نہیں سنا سکتے۔"

بڑے بڑے خوبصورت درختوں، باغوں، کھیتوں اور سانولے چہروں والے شہر گزرتے جا رہے تھے۔ رنگ پور، فرید پور، فینی اور جانے کتنے شہر تھے۔ جن کی رنگین تصویریں آج بھی میری آنکھوں میں ہیں۔ جانے ان شہروں کو پھر کبھی دیکھنا نصیب بھی ہوگا یا نہیں! آج وہ خوبصورت شکلیں یاد آ رہی ہیں۔ جو ان شہروں کے مکانوں، بازاروں، پارکوں اور ہوٹلوں میں دیکھی تھیں۔ خدا جانے وہ لوگ زندہ بچ کر واپس بھی آسکیں ہوں گے یا وہیں کسی جنگل، کسی بازار، کسی پارک اور کسی باغ میں ان کی لاشیں ہڈیوں کے ڈھانچوں میں تبدیل ہو گئی ہوں گی۔ میناتی کے نواح سے گزرتے ہوئے میں نے گھنے درخت دیکھے جن کی شاخیں کتھئی رنگ کے بڑے بڑے پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ میں نے جسیم الدین سے پوچھا کہ اس درخت کا کیا نام ہے۔ اس نے کہا۔

"سی بل۔ سی بل۔"

میں نے ابن انشاء کی طرف دیکھا۔ اس نے سر ہلا کر کہا۔

"شاید اس کا نام دریائی بھینسا ہے۔"

ابراہیم جلیس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"یہ اس زمانے کا پھول ہے جب یہ سارا علاقہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔"

"اب بھی پانی میں ہی ڈوبا ہوا ہے۔"

معلوم ہوا کہ جس درخت کو جسیم الدین سی بل کہہ رہا تھا وہ اصل میں سنبل کا درخت تھا اور یہ درخت ہمارے باغ جناح میں بھی ہیں بلکہ سن آباد میں میرے گھر کے بالکل قریب لگا ہوا ہے۔ جمیل الدین عالی جس کوپے میں سفر کر رہا تھا اس

کی اوپر والی برتھ پر بھی ایک ضعیف العمر شاعر براجمان تھے۔ گاڑی صبح پاربتی پور ریلوے سٹیشن پر رکی تو عالی صاحب لال لال آنکھیں ملتے ہمارے ڈبے میں آکر بولے۔

"یار مجھے اس شاعر نے ساری رات سونے نہیں دیا۔ ہر دو منٹ کے بعد وہ کچھ اس بھیانک انداز میں کروٹ بدلتا رہا کہ برتھ کی چولیں نکل جاتیں۔ خدا کے لیے اس کا کچھ کرو۔"

کرنا کیا تھا بس اس کے نام کی چٹ بھی ہم نے وحید قیصر ندوی کے نام کے ساتھ بدل دی اور دونوں کے بستر بھی موقع پا کر تبدیل کر دیئے۔

گولنڈو جانے کے لیے ہمیں ریل چھوڑ کر ایک جگہ سٹیمر میں سوار ہونا پڑا۔ اس سٹیمر کا نام اوسٹریچ تھا اور ایک چھوٹا سا صاف ستھرا بحری جہاز تھا۔ یہاں بھی ہم تینوں نے ایک ہی کیبن لے لیا۔ ہمارے ساتھ یہاں بھی جسیم الدین تھے۔ کیبن بڑا چمکیلا روشن اور شفاف تھا۔ ہر شے قرینے سے لگی تھی۔ سٹیمر سارا دن دریائے پدما میں چلتا رہا۔ شام کو بڑی خوشگوار خنک ہوا چلنے لگی۔ عرشے پر ایک جگہ لکڑی کی چھت کے نیچے گول میز کے ارد گرد آرام کرسیاں لگی تھیں۔ ہم یہاں بیٹھ کر کافی پینے لگے۔ رات کا کھانا ہم نے ڈائننگ ہال میں بیٹھ کر کھایا۔ کچھ دیر لطیفے بازی کی اور پھر سو گئے۔ ابن انشاء کے دانت میں پھر سے درد شروع ہو گیا تھا۔ سونے سے پہلے اس نے نیم گرم پانی سے غرارے کئے۔ دیسی دوائی کی ایک شیشی نکال کر روئی سے دانت میں دوائی لگائی۔ اس کی گال ایک طرف سے سوج گئی تھی۔ آدھی رات کے بعد کسی وقت میری آنکھ کھلی اور میں عرشے پر آگیا۔ سٹیمر بڑی ہموار رفتار کے ساتھ دریا میں بہا چلا جا رہا تھا۔ دور اندھیرے میں ماہی گیروں کی کشتیوں کے بادبانوں کے سائے نظر آ رہے تھے۔ خنک ہوا میں دریا کی خوشبو تھی۔ ٹھنڈی اور مرطوب خوشبو۔ یہ جنوب مشرقی ایشیا کی خوشبو تھی۔ میں دیر تک عرشے کے جنگلے سے لگا دریا کی لہروں کو دیکھتا اور ان جنگلوں دریاؤں کے بارے میں سوچتا رہا جہاں سے کبھی میں گزرا تھا۔ ان صورتوں کو یاد کرتا رہا۔ جنہیں میں نے کبھی بڑے قریب سے دیکھا تھا اور

جواب وقت کی دھند میں گم ہو چکی تھیں۔

صبح سویرے سٹیمر گولونڈو کی گھاٹ پر لنگر گیا۔ ہمارے پیچھے پیچھے صدر ایوب کا خاص سٹیمر میری اینڈرسن چلا آرہا تھا۔ گولونڈو میں بھی ایک جلسہ تھا جہاں صدر نے لوگوں سے خطاب کیا۔ یہاں سے ہم پھر ایک ریل گاڑی میں سوار ہو گئے اور آگے کو روانہ ہوئے۔ واپسی پر پھر گولونڈو سے اپنے سٹیمر میں آئے اور خدا جانے کونسے گھاٹ کی طرف چل پڑے۔ سارا دن ہمارا سٹیمر صدر کے سٹیمر کے آگے آگے دریاؤں میں سفر کرتا رہا۔ شام سے کچھ پہلے ہمیں بتایا گیا کہ سوٹ وغیرہ پہن کر تیار ہو جاؤ کیونکہ آج شام صدر اپنے سٹیمر کے عرشے پر ہمارے ساتھ ملکی اور غیر ملکی نامہ نگاروں سے ملاقات کریں گے۔

شام کو میں، جلیس اور انشا سوٹ پہن کر صدر کے سٹیمر پر آگئے۔

ڈیک پر ایک طرف لمبی میز پر انواع و اقسام کی اُم الخبائث کی بوتلیں روشنیوں میں چمک رہی تھیں۔ بعض ملکی اور اکثر غیر ملکی صحافی شغل مے میں مشغول تھے۔ مجھے پاک جمہوریت ٹرین کی ڈائننگ کار کے ٹھیکیدار گلشن صاحب کا خیال آگیا۔ وہ ام الخبائث کے بڑے رسیا تھے۔ سوچا اس بہتی گنگا سے کیوں نہ اُن کے لیے ایک چونچ بھر کر لے چلوں۔ میں نے انشا سے کہا۔

"یار میں گلشن صاحب کے لیے یہاں سے سکاچ کی ایک بوتل اڑانا چاہتا ہوں۔"

ابن انشا نے مجھے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

"شرم کرو اور ایسی کمینی حرکت سے باز رہو۔"

میں نے شرم ضرور کی مگر اس حرکت سے باز نہ آیا۔ اب میں بوتل اڑانے کی سکیم پر غور کرنے لگا۔ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ کراچی کے ایک اچکن پوش بزرگ شاعر ام الخبائث کی لمبی میز کے کونے پر ہاتھ رکھے ذرا ٹیڑھے ہو کر ایک صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ ایک طرف کو جھکنے سے اُن کی اچکن کی جیب کا منہ پورا کھلا

تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ بے چاری جیب العطش العطش پکار رہی ہے اور ام الخبائث سے اپنی پیاس بجھانا چاہتی ہے۔ میں نے ابن انشا کو ایک طرف لے جا کر کہا۔

"اگر میرے یار ہو تو میرا ایک کام کرو۔ یہاں سے ٹہلتے ٹہلتے سیدھے اُس میز تک جاؤ اور سامنے پڑی ہوئی بوتلوں میں سے کوئی ایک بوتل اٹھا کر اُس بزرگ شاعر کی اچکن کی کھلی ہوئی جیب میں ڈال دو۔"

ابن انشا نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ مجھے بُرا بھلا کہا لیکن میری سچی لگن کی داد دیجیے کہ میں نے اس پختہ کار ناصح کو آخر ام الخبائث کی میز کی جانب روانہ کر دیا۔ میں دُور کھڑا اُسے میز کی طرف جاتا دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ابن انشا میز کے پاس گیا اور بالکل مشینی انداز میں اُس نے میز پر سے بوتل اٹھائی اور اچکن پوش بزرگ شاعر کی اچکن کی جیب میں ڈال دی۔ اُن صاحب کی جو حالت ہوئی میں اُسے آج تک نہیں بھلا سکا۔ وہ چونکے بلکہ پنجابی میں ٹھٹکے —— جیب کو دیکھا پھر انشا کو دیکھا۔ ساری باتیں بھول گئے اور تیزی سے جیب پر ہاتھ رکھے لکڑی کے تختے پر سے گزر کر اوسٹریچ سٹیمر کے عرشے پر آگئے۔ میں اُن کے پیچھے پیچھے تھا۔ میں نے قریب جاتے ہی ادب سے سلام کیا اور ہاتھ بڑھا کر اُن کی جیب سے بوتل نکال لی۔ وہ تیوری چڑھا کر مجھے اور ابن انشا کو کوسنے لگے لیکن

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

میں بوتل کوٹ کے اندر چھپا سیدھا کیبن میں آگیا۔ یہاں آکر جو دیکھا تو وہ ٹماٹر کی چٹنی کی بوتل تھی۔ ہائے بھولے بھالے انشا کی سادہ دلی! ہائے کم بخت! تو نے پی ہی نہیں!۔ ظالم کو میں نے دریا پر پانی لینے بھیجا تھا وہ مٹھی بھر ریت لے کر آگیا۔

اتنے میں ابن انشا اپنے کارنامے پر بڑا خوش خوش کیبن میں آگیا۔

"پکنے! میں نے یہ کام صرف تمہارے لیے کیا تھا۔"

میں نے ٹماٹر کی چٹنی کی بوتل کا ڈھکن کھولا اور چٹنی کا ایک ڈبل پیگ اس کے سر پر انڈیل دیا۔

ٹرین چٹاگانگ پہنچ گئی۔ صاف ستھرا خوبصورت شہر تھا۔ سڑکوں کے نشیب و فراز اور ارد گرد کی پہاڑیوں کو دیکھ کر مجھے کوہ مری یاد آ گیا۔ سبزہ بہت تھا۔ مکانوں کی سرخ چھتیں ڈھلوان تھیں۔ گھروں کے آنگنوں میں پپیتے، ناریل، تاڑ اور آم کے گھنے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔ کوٹھیوں کی بیرونی دیواریں بارشوں کی وجہ سے سیاہ پڑ چکی تھیں۔ بازار کھلے کھلے تھے۔ بانس اور بید کا فرنیچر بڑا خوبصورت تھا۔ مسجدیں بڑی پرشکوہ تھیں۔ بندرگاہ کی سیر کو گئے تو دیکھا کہ ایک جہاز رنگون سے آ کر جیٹی پر لگا ہے۔ مجھے رنگون میں گزارا ہوا خوبصورت زمانہ یاد آ گیا۔ ایک مسافر سے میں نے پوچھا۔

"کیوں بھائی رنگون کی فریزر سٹریٹ پر سورتی مسجد اب بھی ویسی ہی خوبصورت ہے؟ سپارک سٹریٹ میں ترکی ہوٹل اب بھی چلتا ہے؟ اور سُولی پیگوڈا کی سیڑھیوں پر اب بھی برمی لڑکیاں کنول کے پھول بیچتی ہیں؟"

میرا دل چاہا کہ جب یہ جہاز واپس رنگون کی طرف روانہ ہو تو میں بھی اس میں سوار ہو کر چلا جاؤں اور سولی پیگوڈا کی سیڑھیوں پر کنول بیچنے والی برمی لڑکیوں سے جا کر پھول خریدوں اور گوتم بدھ کے چرنوں میں ارپن کروں۔ انشا میرے ساتھ تھا اور بار بار یاد دلا رہا تھا کہ شام کا کھانا سیٹھ صاحب کے ہاں ہے۔ ان سیٹھ صاحب کا نام میں بھول گیا ہوں۔ بڑے وضع دار، خوش اخلاق اور خاندانی رئیس تھے۔ پابند صوم و صلوٰۃ۔ بڑی محبت سے انہوں نے ہمیں اپنے ہاں کھانے پر بلایا تھا۔ بندرگاہ پر غیر ملکی جہاز بھی کھڑے تھے جن کے مستولوں پر ان کے جھنڈے چٹاگانگ کی خوشگوار ہوا میں لہرا رہے تھے۔

شام کو ہم سیٹھ صاحب کے بنگلے پر گئے۔ ان کا حسین بنگلہ شہر سے باہر ایک ٹیلے

پر تھا۔ ہماری گاڑی دو تین چکر کاٹ کر ان کے بنگلے کے پورچ میں داخل ہوئی۔ وہ خود برآمدے میں موجود تھے۔ خندہ پیشانی سے ملے اور ہمیں ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ ڈرائنگ روم قیمتی قالینوں اور بہترین نوادرات سے سجا ہوا تھا۔ کونوں میں سنہری گلدانوں میں استوائی پھول مسکرا رہے تھے۔ شہر کے کئی ایک معززین اپنی بیگمات کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ ایک نوکر ہارمونیم کی پیٹی لے کر آ گیا۔ اس نے بڑے ادب سے ایک بیگم صاحبہ کے سامنے ہارمونیم رکھا۔ انہوں نے سر پہ ساڑھی کا پلو درست کیا۔ ہارمونیم پر ہاتھ رکھا اور بڑی شریف گھریلو آواز میں علامہ اقبال کی ایک نظم ترنم سے سنائی۔ 'بانگ درا' کی ایک آسان سی نظم تھی۔ ایک صاحب نے بہادر شاہ ظفر کی غزل ترنم سے سنائی۔ اب ہمارے ساتھی شعرا کی باری تھی۔ شہاب صاحب نے ابن انشاء کی طرف اشارہ کر کے نوکر سے کہا۔

"ہارمونیم انشا جی کے سامنے رکھ دیں۔"

ابن انشا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خواتین و حضرات! میں قوالی بعد میں کروں گا۔ فی الحال ایک نظم تحت اللفظ پیش خدمت ہے۔"

میں نے اور جلیس نے بے حد اصرار کیا کہ ابن انشا کو ہارمونیم کے ساتھ نظم سنانی چاہیے۔ لیکن وہ صاف بچ کر نکل گیا اور اس نے اپنی ایک نظم تحت اللفظ سنائی۔ مجھے وہ نظم یاد نہیں رہی۔ اس کے بعد عالی صاحب نے اپنے دلکش دوہے ترنم سے سنائے اور آخر میں حفیظ صاحب نے اپنے کلام بلاغت نظام سنایا۔ فرخ احمد، قوی غلام مصطفےٰ اور جسیم الدین نے اپنا بنگالی کلام پیش کیا۔ قوی غلام مصطفےٰ کی نعت بہت پسند کی گئی۔ سیٹھ صاحب بنگالی نہیں تھے۔ ان کا تعلق غالباً لکھنؤ شہر سے تھا۔ ان کے ہاں ہمیں تہذیب اودھ کی شاندار جھلک دیکھنے کو ملی۔ ڈھاکہ فال ہوا تو خدا جانے کیوں سیٹھ صاحب کا خیال آ گیا۔ ان کے چٹاگانگ شہر والے بنگلے اور خوبصورت ڈرائنگ روم اور ان کی پابند صوم و صلوٰۃ خواتین کا خیال آ گیا۔ سوچا خدا جانے اُن پر

کیا قیامت گزر گئی ہو گی! اللہ کرے کہ وہ لوگ بخیریت ہوں۔

رات گہری ہو چکی تھی کہ ہم لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر واپس ہوتے۔ اُن کے لان میں رات کی رانی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ پورچ میں کھڑے سیٹھ صاحب سفید براق لباس میں ملبوس ہاتھ ہلا ہلا کر ایک ایک کو رخصت کر رہے تھے۔ ان کی مہمان نوازی اور اخلاق سے ہم بہت متاثر ہوتے۔ ہم ٹرین میں آ کر اپنی اپنی سیٹ پر لیٹ گئے اور دعوت کے بارے میں اظہارِ خیال کرنے لگے۔ تقریباً ہر شہر میں ہماری دعوتیں ہوتی تھیں جس کی وجہ سے ہمارے پاس کھانے کے کوپن بچ جاتے تھے۔ میں نے تو ڈائننگ کار کے گلشن صاحب کے پاس اپنے کھانے کے سارے کوپن بیچ ڈالے اور اس کے بدلے اُن سے مختلف قسم کی مشروبات خرید لی تھیں۔

رات ہم نے اپنی ٹرین میں بسر کی۔ دوسرے روز صبح کو ہمیں رانگاماتی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ یہاں کپتائی ڈیم زیرِ تعمیر تھا اور چکمہ قبائل کے سردار راجہ تری دیو رائے کی جانب سے صدر ایوب کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا جانا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ ہماری گاڑیاں سندربن کے گھنے جنگل سے گزریں گی تو میں بہت خوش ہوا۔ ناشتے کے بعد ہم گورنمنٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ یہاں سے ہمارا قافلہ رانگاماتی کی طرف روانہ ہونا تھا۔ کچھ سٹاف کاریں تھیں۔ کچھ مائیکرو بسیں تھیں۔ مجھے اور انشاء کو ایک مائیکرو بس میں جگہ ملی۔ میں کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ قافلہ چل پڑا۔ چاٹگانگ کا نواحی علاقہ شہر سے زیادہ خوبصورت تھا۔ پٹ سن اور دھان کے کھیت جنوری کی دھوپ میں لہلہا رہے تھے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ سنبل اور ناریل کے درخت صبح کی ہوا میں لہرا رہے تھے۔ تالابوں میں کنول کے پھول کھلے تھے۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی مسافت کے بعد پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا۔ اس کے بعد ہماری گاڑیاں ایک جنگل میں داخل ہو گئیں۔ بڑا گھنا جنگل تھا۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ اتار رکھا تھا۔ جنگل کی طرف سے ٹھنڈی مرطوب ہوا آ رہی تھی۔ جس میں ساگوان کے درختوں کی مہک تھی سڑک چھوٹی سی تھی اور پہاڑی کے پہلو سے گزر رہی تھی۔ ابن انشاء اور میں باتیں

بھی کر رہے تھے اور جنگل کے درختوں کو بھی دیکھ رہے تھے۔

"یار اگر اس وقت یہاں سے شیر نکل آئے تو کیا ہو؟"

وحید قیصر ندوی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ گردن گھما کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"جناب ساری رات یہاں ہانکا کرنے والوں نے شیروں کو بھگا دیا ہے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

انشاء نے کہا۔

"شیروں کو معلوم ہے کہ ابراہیم جلیس ہمارے ساتھ جا رہا ہے۔ اس لیے وہ ہرگز ہرگز ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ شیروں کو معلوم ہے کہ اگر ہم آ گئے تو جلیس اپنا حیدرآباد دکن والا رپورتاژ سنانا شروع کر دے گا۔"

اس زمانے میں جلیس کے دکن والے رپورتاژ کی بڑی دھوم تھی۔ ان معنوں میں کہ وہ بہت طویل تھا۔ جنگل سے نکل کر گاڑیاں ایک بار پھر پہاڑی راستے پر سفر کرنے لگیں۔ دوپہر کو ہم لوگ رانگاماتی ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر لباس ٹھیک کیا۔ کھانا کھایا۔ چائے پی اور گورنمنٹ ہاؤس کے لان میں پہنچ گئے۔ یہاں شامیانے لگے تھے۔ سٹیج بنی ہوئی تھی۔ صدر ایوب تشریف لائے تو لوگوں نے تالیاں بجا کر ان کا خیر مقدم کیا۔ راجہ تری دیو رائے نے سپاسنامہ پیش کیا۔ پھر اپنے ہزاروں ایکڑ کے اس علاقے سے دستبرداری کا اعلان کیا جہاں کپتائی ڈیم تیار ہو رہا تھا۔ انہوں نے سارا علاقہ پاکستان کی ترقی و خوشحالی پر قربان کر دیا تھا۔ انہوں نے صدر کو اپنی خاص خاندانی تلوار بھی پیش کی۔

اس کے بعد چکمہ قبیلے کی عورتوں نے رقص کیا۔ ان عورتوں کے رنگ گورے اور نقش چپٹے تھے۔ بڑی خوبصورت اور صحت مند عورتیں تھیں۔ میں نے ابن انشاء سے کہا۔

"جی چاہتا ہے اس علاقے میں شادی کر کے بس جاؤں۔"

ایک ڈرائیور ہماری بات سُن کر پنجابی میں بولا۔

"ایسا نہ کہو بھاجی! میری طرف دیکھو۔ یہاں سیر کو آیا تھا۔ اور بیس برس سے اسی جگہ پڑا ہوں۔ بنگال کا جادو چل گیا۔ خدا بچائے بنگال کے جادو سے۔"

رانگامتی ریسٹ ہاؤس کے لان میں کھڑے ہو کر ہم نے دریائے کرنافلی کا نظارہ کیا جو بہت نیچے وادی میں بہہ رہا تھا۔ اس کے دوسرے کنارے پر سندر بن تھا جہاں بانس اور سنبل کی سبز گھنی چھاؤں میں زرد آنکھوں والے شیر آرام کر رہے تھے۔ کرنافلی میں کچھ بادبانی کشتیاں چل رہی تھیں۔ ان کے بادبان ہوا میں پھولے ہوئے تھے۔

مجھے پرانا بنگالی گیت یاد آ رہا تھا۔ ہرنی کا گیت۔ ایک ہرنی شکاری کے تیر سے زخمی ہو کر گرتی ہے اور شکاری سے فریاد کرتی ہے کہ ارے بھائی! چھاتیوں کے سوا میرے سارے جسم کا گوشت کاٹ کر لے جا۔ ابھی میرا بچہ چھوٹا ہے۔ اُسے میرے دودھ کی ضرورت ہے۔ جب میرا بچہ بھوک سے تڑپ تڑپ اٹھے گا۔ ماں ماں کہہ کر روئے گا۔ تو اس کی پکار دیوتاؤں کے دلوں میں بھی شگاف ڈال دیگی۔ آہ! کیسے تیکھے تیر سے تو نے گھائل کر دیا مجھے! نہ جی بھر کر دیکھ پائی اس کا چاند سا مکھڑا۔ نہ جی بھر کر اُسے دودھ پلایا۔ نہ جی بھر کر اُس سے پیار کر پائی۔ کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا تو نے او بھائی تیر انداز!—

ہرنی کے اس گیت میں دکھ بھری انسانیت کی پکار تھی۔

مجبور اور بے بس انسانوں کی بپتا تھی۔ آج کا انسان بھی شکاری کے تیر سے گھائل ہے اور خون میں ڈوبا زمین پر پڑا اپنی موت کا انتظار کر رہا ہے۔ اُسے اپنے بچے یاد آ رہے ہیں۔ وہ شکاری کے ظلم کا شکار ہے مگر شکاری کو بھائی تیر انداز کہہ کر مخاطب کر رہا ہے۔ تیسرے پہر ہمارا قافلہ واپس چٹاگانگ کی طرف روانہ ہوا۔ واپسی پر ایک دریا پر سے گزرتے ہوئے مجھے دریا کنارے خانہ بدوشوں کے جھونپڑے نظر آئے اور مجھے خانہ بدوشوں کا وہ گیت یاد آ گیا جو مجھے قومی جسیم الدین نے ڈھاکہ میں سنایا تھا۔

"الوداع! میرے دوستو الوداع!
میرا گھر دریائے پدما میں ہے۔
ہم مچھلیاں پکڑ کر اپنی روزی کماتے ہیں۔
ہماری خوشی کی کوئی حد نہیں۔
ہم ان قیمتی پتھروں کا بھی کاروبار کرتے ہیں۔
جنہیں ہم جان کی بازی لگا کر
زہریلے سانپوں کے بلوں سے باہر نکالتے ہیں۔

ہم دریا کے ایک کنارے پر کھانا پکاتے ہیں۔
اور دوسرے کنارے پر اُسے کھاتے ہیں۔
ہمارا کوئی گھر نہیں۔
ساری دنیا ہمارا گھر ہے۔"

گاڑیاں دریا کے پل پر سے گزرنے کے بعد جنگل میں داخل ہو گئیں۔ ہرے بھرے بانس کے گھنے جھنڈ، ساگوان کے ذخیرے، کیلے اور چھالیہ کے درختوں کی قطاریں، اور درختوں کے تنوں سے لپٹی ہوئی جنگلی بیلیں ــــ سارے جنگل میں سبز، ٹھنڈا اندھیرا سا پھیلا تھا۔ شام ہونے سے پہلے ہم لوگ چٹاگانگ پہنچ گئے۔ آدھی رات کو یہاں سے ہماری ٹرین سلہٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔ سلہٹ ــ چائے کے باغوں کا چھوٹا سا صاف ستھرا شہر ــــ آسام کی سرحد پر رکھا ہوا چائے کا سبز پیالہ!

ساری رات گاڑی چھوٹے چھوٹے گاؤں قصبے پیچھے چھوڑتی سفر کرتی رہی۔ دوسرا دن بھی سفر میں گزر گیا۔ اتنے شہر نہیں آئے جتنے دریا گزر رہے تھے۔ بانس کے پل والی نہریں، دھان اور پٹ سن کے کھیت۔ آم اور کیلے کے گھنے باغوں کے بیچوں بیچ جانے والی پگڈنڈیاں اور ان پر سے گزرتی سانولی سانولی، کاسنی ساڑھیوں والی بنگالی دیہاتی عورتیں۔ گاگریں اٹھائے تالاب کی طرف جاتیں۔ معصوم بنگالی بچے جو گاڑی کو آتا دیکھ کر کھیتوں میں کھڑے ہو جاتے اور دُور سے ہاتھ ہلانا شروع کر دیتے۔ گاڑی دریا کے پُل پر سے گزرتی تو پانی کی پُرسکون نیلی سطح پر کشتیوں کی قطاریں رواں دکھائی دیتیں۔ کھپریل چھتوں کے اوپر کیلے اور شریفے کے درخت لہرا رہے تھے۔

پھول باڑی، رینی، فرید پور، کومیلا ــــ پرانے مکانوں کی بارش زدہ کالی دیواریں۔ چھوٹے چھوٹے دروازے۔ لمبی کھڑکیاں۔ آنگن کی دیواروں کے اوپر سے جھانکتے پھولوں بھرے درخت۔ غریب بستیوں کی جھونپڑیوں میں گم ہوتی ہوئی پگڈنڈیاں پانی سے بھرے ہوئے سبز تالاب اور کنول کے پھول اور پرانے تالابوں کی کائی لگی سیڑھیوں

کی دراڑوں میں اُگی لمبی گھاس۔ میں کھڑکی کے ساتھ لگا باہر دیکھ رہا تھا۔ جلیس اوپر والی برتھ پر سو رہا تھا۔ ابن انشا اپنی سیٹ پر بیٹھا گھر خط لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ٹرین کسی شہر کے نواح سے گزر رہی تھی۔ میں نے ایک بچی کو دیکھا۔ وہ اپنے مکان کے آنگن میں کھڑی تھی۔ اس نے ایک جھاڑی کی ٹہنی کو جھکا کر پھول توڑے اور بھاگ کر اندر چلی گئی۔

میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔ کہاں کہاں لوگ اپنے اپنے گھروں میں اپنی اپنی زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ جس کمرے میں یہ لڑکی بھاگ کر گئی ہے وہاں ضرور ایک پلنگ بچھا ہو گا۔ اُس پر پھولدار چادر پڑی ہو گی۔ تپائی پر ایک گلدان رکھا ہو گا۔ بچی وہ پھول جا کر گلدان میں لگا دے گی۔ پھر رسوئی سے کسی عورت کی آواز آئے گی اور وہ "آئی دیدی" کہہ کر رسوئی کی طرف دوڑ جائے گی۔ ایک سرخ بندیا والی بنگالی لڑکی اپنے مکان کی کھڑکی کا آدھا پٹ کھولے ہماری ٹرین کو گزرتا دیکھ رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں دونوں ہاتھ جوڑ کر اُسے نمسکار کیا۔

کیا یہ کھڑکی ٹرین کے ساتھ نہیں جا سکتی؟

اب اس سرخ بندیا والی لڑکی کو پھر کبھی دیکھنا نصیب نہیں ہو گا۔ پھر کبھی اس سانولے خاموش چہرے کے درشن نہیں ہوں گے۔ وقت کے سمندر میں ایک حسین چہرہ پل بھر کے لیے اُبھر کر ڈوب جاتا ہے اور پھر کبھی دکھائی نہیں دیتا۔ شاید کبھی بڑھاپے کے آخری موڑ پر دوبارہ ملاقات ہو جائے، لیکن پھر ایک دوسرے کو کوئی بھی نہ پہچان سکے گا۔ کوئی ایک دوسرے سے نہیں کہے گا کہ میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے!

دیوداس پنجا تھا جس نے آخری بار اپنی پاروتی کو دیکھا اور مر گیا۔ مجھے بردوان کا سٹیشن یاد آ گیا۔ کلکتے کے قریب یہ سٹیشن آتا ہے۔ یہاں سے ایک کچی چھوٹی سی سڑک کھیتوں کھیت کسی زمیندار کی پرانی حویلی کو جاتی ہے۔ یہاں چھالیہ اور تاڑ کے درخت۔ خلیج بنگال کی طرف سے آنے والی مرطوب ہواؤں میں جھوما کرتے

ہیں۔ مدت ہوئی اس کچے راستے سے رات کو ایک بیل گاڑی گزری تھی۔ اس میں ایک قریب المرگ بنگالی نوجوان سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کا نام دیوداس تھا۔ وہ اپنی محبوبہ پاروتی سے زندگی کی آخری ملاقات کرنے جا رہا تھا۔ گاڑی بان دھیمے سُروں میں گا رہا تھا۔

نہ پی کی نگریا آئے ہے
نہ چین کہ بجوا پائے ہے
رات اندھیری رستہ دُور
تھک کر ہوا مسافر چُور
دھیرے دھیرے تیرا جیون
دیپک بجھتا جائے ہے
نہ پی کی نگریا آئے ہے (آرزو لکھنوی)

آسمان پر شام کی سُرخی پھیل رہی تھی کہ گاڑی سلہٹ پہنچ گئی۔

میں اور انشاء سلہٹ کے بازاروں میں سیر کرنے نکل آئے۔ کُھلے کُھلے کشادہ بازار۔ دکانوں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ ہوا میں قسم قسم کے پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ کچھ لڑکیاں بالوں میں سفید پھول لگائے گزر گئیں۔ ایک دکان سے کسی عورت کے بنگالی گانے کی دل گداز آواز آئی۔ یہ گراموفون ریکارڈوں کی دُکان تھی۔ ہم دُکان میں داخل ہو گئے۔ دکاندار گراموفون کے پاس کھڑا اُسے چابی دے رہا تھا۔ ہم کاؤنٹر کے پاس کھڑے بنگالی گیت سنتے رہے۔ گیت ختم ہوا تو میں نے دکاندار سے گانے والی کا نام پوچھا۔ اُس نے مُسکرا کر کہا۔

"اپلا سین۔"

ابن انشاء نے سر ہلا کر کہا۔

"بہت خوب! بہت خوب! عالم لوہار کا کوئی ریکارڈ ہو گا؟"

"جی۔ کس کا ریکارڈ؟" دکاندار نے جھک کر پوچھا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ آپ نہیں سمجھیں گے۔ ہم لاہور جا کر عالم لوہار صاحب سے خود ریکارڈ لے لیں گے۔"

ہم ایک اور بازار میں آ گئے۔ ہوٹلوں سے بنگالی گانوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کوئی لڑکی بالوں میں پھول سجائے قریب سے گزرتی تو بڑی گہری پُراسرار خوشبو آتی۔ اور مجھے تاریخ کے اوراق میں گم پرانے جنگلوں کا خیال آتا جہاں کالی آنکھوں والی دیوداسیاں گلے میں سُرخ پھولوں کے ہار سجائے سیاہ مندروں میں چاندنی راتوں میں رقص کیا کرتی تھیں۔ ہم نے ایک ریستوران میں بیٹھ کر سلہٹ کی چائے پی۔ بڑی ہی بدذائقہ چائے تھی۔ ہمیں لاہور کے ٹی ہاؤس کی چائے بہت یاد آئی۔ ریستوران سے نکل کر ہم نے ایک دکان پر جا کر پان کھائے۔ ایک نو عمر لڑکا پان لگا رہا تھا۔ اس کا نام محمود عالم تھا۔ میں نے اُسے کہا۔

"بھائی محمود عالم! تمہارا شہر بڑا خوبصورت ہے۔"

محمود عالم مسکرا دیا۔ رات ہم نے سلہٹ میں ہی بسر کی۔ دوسرے دن واپس ڈھاکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹرین چلی جا رہی تھی۔ جسیم الدین نے اپنی بنگالی نظموں کے انگریزی تراجم سنانے شروع کر دیئے۔ ابن انشاء ٹھیٹ دوآبے کی پنجابی میں جسیم الدین کی نظموں پر ساتھ ساتھ تبصرہ کرتا جا رہا تھا۔ ابراہیم جلیس قہقہے پر قہقہہ لگا رہا تھا اور ساتھ ساتھ دکنی زبان میں جسیم الدین کی نظموں کی تعریف بھی کر رہا تھا۔ جسیم الدین کی نظمیں ختم ہو گئیں تو اس نے ایک بیراگن کا قصہ سنایا۔ اس قصے نے ہم سب کو مسحور کر دیا۔ یہ جسیم الدین کی جوانی کی آوارہ گردیوں کا قصہ تھا۔ وہ اپنے بے ساختہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"پھول باڑی سے آگے ایک گاؤں ہے۔ چھوٹا سا سٹیشن ہے۔ میں اپنی آوارہ گردیوں کے سلسلے میں وہاں گیا ہوا تھا۔ بیاربتی پور کی جانب سے ایک گاڑی آ کر وہاں رُکی۔ ایک ڈبے میں سے کچھ بیراگی لوگ نکلے۔ بیراگی

ہمارے ہاں خانہ بدوش گویّوں کو کہتے ہیں۔ جو ٹولیاں بنا کر دیہات میں گھومتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ بیاہ شادیوں یا دوسرے خوشی کے موقعے پر اپنے آپ ہی لوگوں کے گھروں میں پہنچ کر اپنی محفل جما دیتے ہیں اور پھر جو کچھ بھی مل جائے لے کر آگے چل دیتے ہیں۔

ٹرین سے جو بیراگیوں کی منڈلی اُتری اُس میں ایک بیراگن بھی تھی۔ گیروے رنگ کی ساڑھی۔ ہاتھ میں اکتارا۔ پاؤں سے ننگی۔ لمبے سیاہ کھلے بال شانوں پر بکھرے ہوئے۔ ماتھے پر تلک اور گلے میں سُرخ منکوں کی مالا۔ اُس کے حُسن نے سٹیشن پر آگ سی لگا دی۔ ہر کوئی بُت بنا اُسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کسی کو پلک جھپکنے کی فرصت نہیں تھی۔ بیراگن بہت حسین تھی۔ اُس کے چہرے میں ایک جادو تھا۔ ایک زبردست کشش تھی۔ میں بھی بُت بنا اس کو دیکھے جا رہا تھا۔ حسین دلربا ایک شعلہ تھی جس نے ٹرین سے نکلتے ہی پلیٹ فارم کو چکا چوند کر دیا۔ بیراگن بڑی شان بے نیازی سے اپنی ٹولی کے ساتھ سٹیشن سے باہر نکلی اور دیکھتے دیکھتے پگ ڈنڈی کا موڑ گھوم کر کیلے کے جھنڈوں میں گم ہو گئی۔ میں نے سٹیشن ماسٹر سے پوچھا۔ یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ اُس نے بتایا ساتھ والے گاؤں کے مکھیا کے لڑکے کی سالگرہ ہے۔ وہاں ان کو رات بھر گانا بجانا ہوگا۔ میں بھی رات کو وہاں جا پہنچا۔ پیپل کے درخت تلے دریاں بچھی تھیں۔ گیس کے ہنڈے روشن تھے۔ گاؤں کے لوگ دریوں پر دائرہ بنا کر بیٹھے تھے۔ بیراگن ان میں پان چھالیہ تقسیم کر رہی تھی۔ لوگ اُس کے حُسن سے مسحور تھے۔ بیراگن کے ساتھی ساز سُر کر رہے تھے۔ بیراگن دری پر بیچ میں آ کر بیٹھ گئی۔ براگیوں نے اکتارے چھیڑ دیئے۔ گھنٹی، ڈفلی اور بانسری کی ملی جلی آوازوں نے وہاں ایک سماں باندھ دیا۔ بیراگن نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر ایک

ہاتھ ذرا سا اٹھا کر گانا شروع کر دیا۔ اس کی آواز بڑی پرسوز اور دلگداز تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی بیوہ دلہن بال بکھرائے اپنے پتی کی سمادھی کو جا رہی ہے۔ کچھ دیر وہ اکیلی گاتی رہی پھر دوسرے بیراگی بھی اُس کے ساتھ گانے لگے۔ اب ایسا ہوتا کہ لمبی لے میں ایک مصرعہ بیراگن گاتی اور وہی مصرعہ بیراگی دہراتے۔ پھر بیراگن آہستہ سے اٹھی اور اس نے خواب آلود انداز میں رقص کرنا شروع کر دیا۔ اس کا جسم گیت کے

دردناک لہجے میں نرت کر رہا تھا۔ گیت کی لے کے ساتھ ساتھ رقص کی گردشیں بھی تیز تر ہوتی چلی گئیں۔ ایک بول بیراگی کہتے اور دوسرا بول بیراگن کہتی۔ اس کے لمبے سیاہ بال ہوا میں گردش کر رہے تھے۔ اس کی پیشانی اور بازوؤں پر پسینے کے موتی جھلملانے لگے تھے۔ کبھی وہ عجیب اداس انداز میں اپنے کسی ان دیکھے پریتم کو دیکھ کر مسکراتی اور کبھی ایک دم سے یوں غمگین ہو جاتی جیسے اب کبھی اپنے محبوب سے ملاقات نہ ہوگی۔ رقص نغمے میں اور نغمہ رقص میں ڈھل گیا تھا۔ اس کی آواز ایک دلسوز فریاد بن گئی تھی۔ بیراگن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اب جو میں نے دیکھا تو محفل میں بیٹھے تقریباً ہر آدمی کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے اور کپکپاتے ہونٹوں کے ساتھ رو رہا تھا۔ گیت جو بیراگن گا رہی تھی یہ تھا: "مجھے بتاؤ میں کب تک انگارے کھاتی رہوں؟ جسے محبت کا سانپ ایک بار ڈس جاتا ہے، پھر وہ کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ دریاؤں کے دیوتاؤں سے کہو میرا محبوب مجھے واپس کر دے۔ وہ میرے لیے مچھلیاں پکڑنے گیا تھا۔ وہ پھر واپس نہیں آیا۔"

میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ میں بھی رونے لگا۔ وہ رات مجھے خواب کے اندر گزاری ہوئی کوئی رات معلوم ہوتی ہے۔ بیراگن رات کے پچھلے پہر کے دھندلکوں میں لوگوں کو مسحور چھوڑ کر اپنی ٹولی کے ساتھ چلی گئی۔ اس کے بعد میں نے اُسے پھر کبھی نہیں دیکھا۔ ہاں! اس کے

بالوں میں لگا ہوا سُرخ گل مہر کا پھول آج بھی یاد ہے جو سیاہ بالوں میں سُرخ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔"

جسیم الدین ایک جادوگر داستان گو کی طرح بیراگن کی کہانی سنا رہا تھا۔ یہ ساری کہانی اُس نے اپنی مخصوص انگریزی میں سنائی تھی۔ بیچ میں کہیں کہیں وہ اردو بھی بولنے لگتا تھا۔ کہانی نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میں خود بیراگن کے سحر میں گرفتار ہو گیا۔ میں نے تو جسیم الدین سے پوچھا کیا واقعی پھر اس بیراگن سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی؟

اُس نے کہا۔

"اس واقعے کو بیس برس گزر چکے ہیں۔ میں نے اُس بیراگن کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ خدا جانے وہ زندہ ہے کہ مر گئی ہے۔ لیکن وہ مر نہیں سکتی۔ اُس کے حسن میں اتنا دبدبہ اور ہیبت تھی کہ موت بھی اس سے ہار گئی ہو گی۔"

ابراہیم جلیس اس کہانی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اُسے نیند آگئی اور وہ برتھ پر دراز ہو کر سو گیا۔ ابن انشاء میرے ساتھ بیٹھا کہانی کو بڑے غور سے سنتا رہا اور جب جسیم الدین بھی اپنی کہانی کے اثر سے مسحور ہو کر اونگھنے لگا تو انشاء بولا۔

"یار بنگال میں واقعی جادو ہے۔ یہاں کی عورتیں مردوں پر جادو کرتی ہیں۔ جسیم الدین بڑا حقیقت پسند شاعر ہے لیکن بیراگن اسے بھی دیوانہ بنا گئی۔"

میں نے کہا۔

"جسیم الدین کی جگہ میں ہوتا تو بیراگن کے ساتھ ہی اک تارا لے کر نکل جاتا اور پھر کبھی شہر والوں کو اپنا منہ نہ دکھاتا۔"

انشاء نے کہا۔

"یہ کام تو تمہیں اس وقت بھی کرنا چاہیے۔ یعنی اک تارا لے کر کسی سٹیشن

پر اتر جاؤ اور پھر کبھی ہمیں اپنا منہ نہ دکھاؤ۔ مگر سوال یہ ہے کہ کم بخت اک تارا کہاں سے آئے گا؟ اچھا ڈھاکہ ریڈیو سٹیشن چل کر کسی سے بات کرتے ہیں۔"

ایک جگہ ہم نے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ کھیتوں میں پٹ سن کے چھپّر دیکھے جنہوں نے کھیتوں کے کھیت ڈھانپ رکھے تھے۔ ہم نے جسیم الدین کو جگا کر پوچھا۔

"بھائی جسیم الدین یہ کیا ہے؟"

جسیم الدین جیب سے عینک نکال کر بولا۔

"کہاں کیا ہے؟"

"وہ سامنے کھیتوں پر چھپریں کیسی پڑی ہیں؟"

"اوہ وہ! آہا ہا۔ بھائی وہ پان کی بیلوں کو ڈھانپا گیا ہے۔ بنگلہ پان۔ سانچی پان۔ ہی ہی ہی۔ ادھر کا پان بڑا گرم ہوتا ہے۔"

گاڑی ایک بڑے خوبصورت شہر کے سٹیشن پر رُک گئی۔ میں اس شہر کا نام بھول گیا ہوں۔ وہاں کی رائٹرز گلڈ نے ہمیں دعوت دے رکھی تھی۔ اس شہر میں جھیلیں اور باغ بہت تھے۔ سارا شہر درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ وہاں کی رائٹرز گلڈ کا دفتر ایک اونچی جگہ پر تھا۔ ٹیریس میں بید کی آرام کرسیاں ڈال دی گئی تھیں۔ میزوں پر سیب، کیلا، انار اور دیگر کھانے پینے کی اشیاء قرینے سے رکھی تھیں۔ ایک نوجوان مجھ سے آٹوگراف لینے لگا تو میں نے اس کی آٹوگراف بک پر لکھا۔

"یہ جگہ اتنی خوبصورت ہے کہ مجھے خیال آتا ہے کاش میں اپنی بیوی کو ساتھ لے آتا۔"

اب وہ نوجوان آٹوگراف لے کر شہاب صاحب کی طرف بڑھا۔ انہوں نے میرا آٹوگراف پڑھا اور مسکرائے۔ پھر لکھا۔

"یہ جگہ اتنی خوبصورت ہے کہ مجھے خیال آتا ہے کہ میں اپنی بیوی کو کیوں ساتھ لے آیا۔"

ابن انشاء نے آٹوگراف بک پر اپنا ایک شعر لکھا۔ ابراہیم جلیس نے کوئی مزاحیہ بات لکھی جس پر تمام لوگ ہنسنے لگے۔ ایک سٹیشن پر گاڑی رُکی تو ہم نے انناس خرید کر کھائے۔ ابراہیم جلیس کہنے لگا۔

"یار ہمارے دکن میں یہ انناس اتنے عام تھے کہ گائے بھینس کھایا کرتی تھیں۔"

ابن انشاء بولا۔

"بکواس نہ کرو۔ میں تمہارے دکن کی پوری تاریخ سے واقف ہوں وہاں تو انناس ہوتا ہی نہیں۔"

جلیس قہقہہ لگا کر بولا۔

"اچھا؟ کہنے ہمیں معلوم ہی نہیں۔ ہمیں پہلے بتا دیا تھا۔ مگر یار اتنا یاد ہے کہ انناس قسم کی ایک چیز ہم ضرور کھایا کرتے تھے۔"

انشاء نے کہا۔

"تم کچھ بکواس کھاتے رہے ہو۔ بہر حال وہ انناس نہیں تھا۔"

ایک شہر سے ٹرین گزری تو میں نے دیکھا کہ ریلوے لائن کے پار کوئی سو گز کے فاصلے پر ایک مکان پر بھارت کا ترنگا لہرا رہا ہے۔ میں بڑا حیران ہوا کہ یہاں بھارت کا جھنڈا کہاں آگیا؟ میں نے جسیم الدین سے پوچھا۔

"بھائی یہ کوئی بھارت کا سفارتی دفتر ہے؟"

جسیم الدین مسکرایا۔

"ارے بابا! یہ بھارت ہے۔ انڈیا ہے۔ یہ سارا علاقہ انڈیا کا بارڈر جا رہا ہے۔"

پاکستانی ریلوے لائن اور بھارت کے علاقے کے درمیان صرف ایک تار کا جنگلہ ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ اس جنگلے کو انسان بڑے آرام سے پھلانگ سکتا تھا۔ ابن انشاء اور جلیس نے بھی اس علاقے کو بڑے تعجب سے دیکھا۔

"یہاں تو سمگلنگ بڑے آرام سے ہو سکتی ہے۔"

"بھائی! ہو رہی ہے۔ دن رات ہو رہی ہے۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے" جسیم الدین نے کہا۔

پھر قوی جسیم الدین انگریزی میں اپنی بنگالی نظم کا ترجمہ سنانے لگا۔ پاک جمہوریت ٹرین برق رفتاری سے ڈھاکہ کی طرف اڑی چلی جا رہی تھی۔ اب اُسے کسی چھوٹے سٹیشن پر نہیں رُکنا تھا۔ دھان اور پٹ سن کے کھیت پیچھے جا رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے شہر اور قصبے گزر رہے تھے۔ کبھی دل میں یہ گمان بھی نہ گزرا تھا۔ کہ ان علاقوں سے ہمارا ناطہ ٹوٹ جائے گا۔ یہ ماہی گیروں کے میٹھے گیت پھر کبھی سننے کو نہیں ملیں گے۔ یہ خلیج بنگال کی ہواؤں میں جھومتے ناریل اور تاڑ کے درخت پھر کبھی دکھائی نہ دیں گے۔ ایک بہت بڑا دریا آیا۔ اس کا پُل بہت اونچا تھا۔ اور انجینئرنگ کا اعلیٰ ترین نمونہ تھا۔ دریا کا چوڑا پاٹ دھوپ میں چمک رہا تھا۔ کئی ایک کشتیاں چل رہی تھیں۔ دور ایک سٹیمر سامان اور مسافر لادے سیٹی بجاتا چلا جا رہا تھا۔ آج اس دریا کو یاد کرتا ہوں۔ تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خواب میں ایک دریا دیکھا تھا۔ خواب میں ایک خواب دیکھا تھا۔ ٹرین ڈھاکہ پہنچ گئی۔ کملا پور سٹیشن پر بڑا رش تھا۔ مسافر سامان اٹھائے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ شاید کوئی گاڑی چھوٹنے والی تھی۔ انشاء نے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر ایک چھوٹی سی انگڑائی لی اور عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے بولا۔

"لو میاں! مشرقی پاکستان کی سیاحت بھی کر لی۔ ویسے یار رانگا ماتی کی گرمزی یاد رہے گی۔"

ابراہیم جلیس بالوں میں کنگھی کرتا قریب آیا۔

"سنا ہے مغربی پاکستان سے ادیبوں کا بہت بڑا وفد ڈھاکہ پہنچ چکا ہے۔"

"سنا تو ہم نے بھی ہے۔ چلو بھائی گاڑی میں بیٹھو۔ ہوسٹل چل کر تازہ دم ہوتے ہیں۔"

ہوسٹل پہنچے تو وہاں بڑی رونق لگ رہی تھی۔ کراچی، پنڈی، پشاور اور لاہور سے کتنے ہی ادیب اور شاعر آئے ہوئے تھے۔ لان میں آرام کرسیوں پر شاہد احمد دہلوی۔

ڈاکٹر جاوید اقبال، قرۃ العین حیدر اور امیر حمزہ شنواری بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ناصر کاظمی مسکراتا ہوا ہماری طرف بڑھا۔ باری باری سب سے گلے ملا۔

"اے حمید! ایک مدت کے بعد ناریل کا درخت دیکھا۔ سُنا ہے آج کل یہاں کوئلیں بھی بولتی ہیں۔"

ابراہیم جلیس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کوئلہ کھایا کوئل؟"

ناصر کاظمی نے تعجب کیا۔ "کوئل؟"

ابن انشاء نے کہا۔

"ہاں میاں! یہاں جو آتا ہے اسے پہلے روز کوئلہ ضرور رکھنا پڑتا ہے۔ آؤ ہمارے ساتھ۔"

ہم ناصر کاظمی کو اپنے کمرے میں لے گئے اور 'کوئلے' کی پلیٹ منگوا کر اُس کے آگے رکھ دی۔

"لو کھاؤ کوئلہ"

ناصر کاظمی بڑا ہنسا اور بڑے شوق سے کوئلہ یعنی کیلے کھانے لگا۔ سگریٹ اب بھی اس کی انگلیوں میں جل رہا تھا۔ یہ وصف صرف ناصر کاظمی میں ہی دیکھا کہ سارا سگریٹ اُس کی انگلیوں میں جل جاتا تھا مگر کیا مجال کہ کسی انگلی کو آنچ آ جائے۔ دوسرے احباب بھی باری باری ملے۔ یہ اصحاب مشرقی پاکستان رائٹرز گلڈ کی دعوت پر آئے تھے۔ اگلے روز یہ سب لوگ سندربن کی سیر کو جا رہے تھے۔ قوی جسیم الدین نے تمام احباب کو رات کے کھانے کی دعوت دے رکھی تھی۔

قوی جسیم الدین کا گھر ڈھاکہ شہر سے باہر ایک تالاب کے کنارے پر تھا۔ اس تالاب کے کنارے ایک پرانی کشتی آدھی پھنسی ہوئی نہ جانے کب سے وہاں پڑی تھی۔ مکان کے دروازے پر سیڑھیوں کے پاس ایک سفید فراک والی بڑی معصوم بچی رنگ برنگے پھولوں کے ہاروں کی چنگیر رکھے کھڑی تھی۔ ہر مہمان کو ایک ایک ہار دے رہی تھی۔

مہمان اس کا شکریہ ادا کرتا اور بچی کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار کرتا۔ دو سیڑھیاں چڑھ کر ایک برآمدہ تھا۔ پھر ایک کھلا کمرہ تھا جہاں زمین پر دریاں بچھی تھیں۔ کنارے پر کرسیاں اور صوفے لگے تھے۔ مہمان یہاں بیٹھتے چلے گئے۔ چھت میں بڑی تیز روشنی والا بلب روشن تھا۔ قوی جسیم الدین نے بڑا پُرتکلف کھانا پکوایا تھا۔ بریانی قورمہ بھی تھا اور دال بھات بھی جس کا جو جی چاہے کھائے۔ سویٹ ڈش کے لیے کوری مٹی کے کاغذی پیالوں میں کھیر آئی۔ جس پر زعفران سے بنگالی میں کچھ لکھا تھا۔ جلیس نے انشاء سے پوچھا۔

"یہ کھیر پر کیا لکھا ہے؟"

ابن انشاء نے کہا۔

"لکھا ہے۔ ٹیڑھی کھیر۔۔۔"

پُرتکلف کھانے کے بعد چائے اور کافی کا دور چلا۔ لوگ ٹولیوں میں بٹ گئے اور دنیا جہان کے موضوعات پر باتیں شروع ہو گئیں۔ اتنے میں ہال کمرے کے بیچ میں آ کر گانے بجانے والے بیٹھ گئے۔ ایک دبلی پتلی سانولی سی لڑکی نے آ کر سب کو ادب سے سلام کیا۔ سیاہ آنکھیں، تیکھے نقش اور لمبے سیاہ بال ۔۔۔ یہ اُس زمانے کی جھرنا اور آج کی مشہور فلم ایکٹریس شبنم تھی۔ قوی جسیم الدین نے اس کا تعارف کروایا کہ یہ جھرنا دسویں جماعت میں پڑھتی ہے اور رقص کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ جھرنا کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی تھی۔ اس کا رنگ ذرا کھلا تھا اور قد چھوٹا تھا۔ دونوں نے سفید ساڑھیاں پہن رکھی تھیں۔ ماتھے پر تلک لگے تھے۔ ساز بجنے لگے۔ مردوں نے گانا شروع کر دیا اور دونوں بنگالی لڑکیاں رقص کرنے لگیں۔ پہلے انہوں نے بنگال کے ایک ماہی گیر کی زندگی کا نقشہ بیان کیا۔ ساتھ ساتھ وہ گیت بھی گانے لگیں۔ وہ رقص کی دھیمی گردشوں اور حرکت سے گیت کا مفہوم بھی ادا کر رہی تھیں۔ کبھی وہ ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بارش کی دعا کرتیں۔ کبھی بازوؤں اور انگلیوں کی تیز حرکت سے برستی بارش کا سماں پیش کرتیں۔ کبھی زمین

پر جھک کر دھان کی پنیری بوتیں۔ کبھی دریا پر کشتی کھیتیں، کبھی لہلہاتے کھیتوں کو دیکھ کر خوشی سے جھوم جھوم اٹھتیں۔ پھر ایکدم سے سہم کر ایک طرف کھڑی ہو جاتیں جیسے ساہوکار فصل میں سے اپنا حصہ لینے آ گئے ہوں۔ کبھی وہ ایک بچے کو گود میں سنبھالتیں اور کبھی دوسرے بچے کو چپ کراتیں۔ پھر وہ سر جھکا کر اکھڑے اکھڑے قدموں کے ساتھ رقص کرنے لگتیں اور بار بار آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتیں۔ جیسے آسمان سے انصاف کی طلب گار ہوں۔ اب ان کے ساتھ دو مرد بھی رقص کرنے لگے تھے۔

ان لوگوں نے کئی ایک رقص اور گیت پیش کیے۔ جسے سب لوگوں نے بے حد پسند کیا۔ مہمانوں نے رخصت ہوتے وقت قمری جسیم الدین کی مہمان نوازی کا بے حد شکریہ ادا کیا۔ قمری جسیم الدین بار بار جھک کر کہہ رہا تھا۔

"مجھے خوشی ہوئی ہے۔ بہت خوشی ہوئی ہے۔"

رات کو گلشن سینما کے ہال میں مشاعرہ بھی تھا۔ جسیم الدین کے گھر سے شاعر حضرات سیدھے گلشن سینما کی طرف چل دیئے۔ ابن انشاء کو دعوت دی گئی تھی مگر اُس نے کلام نہ سنانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ میں نے جلیس نے اُسے بہت مجبور کیا تو وہ راضی ہو گیا۔

"گھبراؤ نہیں ہم تمہارے ہر شعر پر داد دیں گے۔"

ال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مشاعرہ شروع ہو گیا۔ ابن انشاء کو عالی اور شہاب صاحب نے بھی قائل کر لیا تھا کہ اُسے اپنا کلام ضرور سنانا چاہیے۔ میں نے اُسے کہا۔

"پھر کیا ہوا جو لوگ تمہارے کلام پر ہوٹنگ کرتے ہیں۔ کچھ اخلاقی تقاضے بھی ہوتے ہیں۔"

ابن انشاء کا نام پکارا گیا تو وہ بڑے سکون سے اٹھ کر سٹیج تک گیا۔ مائیکروفون کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ ایک دو دلچسپ فقرے چست کیے اور ایک غزل تحت اللفظ پڑھ کر سنائی۔ خلاف معمول وہاں اُسے لوگوں نے سچ مچ کی داد دی۔ ہمیں بڑی

حیرانی ہوئی۔ جب وہ واپس ہمارے پاس آیا۔ تو میں نے کہا۔

"یہ غزل تمہیں کس نے لکھ کر دی تھی؟"

ابن انشاء مجھے گالیاں دینے لگا۔ میں شاید سگریٹ لینے ہال سے باہر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ناصر کاظمی سلگتے سگریٹ والا ہاتھ ہونٹوں کے پاس کیے برآمدے میں ایک طرف چلا جا رہا ہے۔

"ارے میاں! تم کدھر جا رہے ہو؟"

ناصر کاظمی نے کہا۔

"سٹیج پر شاید میرا نام پکارا گیا ہے۔ اس لیے بھاگ رہا ہوں۔"

"بھائی خدا کے لیے ایسا نہ کرنا۔ چلو واپس چلو۔"

اور میں اُسے کھینچ کھانچ کر سٹیج پر لے گیا اور سکریٹری کے حوالے کر دیا۔

"میاں یہاں تک تو میں اس شخص کو لے آیا ہوں۔ اب تم جانو تمہارا کام۔"

ناصر کاظمی واقعی اپنی ترنگ کا شاعر تھا۔ ہمیشہ مشاعرے میں دیر سے آتا اور کبھی کبھی اپنی باری آنے سے پہلے ہی مشاعرہ چھوڑ کر چلا جاتا۔ گلشن سینما والا مشاعرہ بڑا کامیاب رہا۔ یعنی وہاں ابن انشاء کو بھی داد ملی۔ اس سے زیادہ اس مشاعرے کی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے؟ میں نے اور جلیس نے انشاء کو خوب تنگ کیا۔ مشاعرہ رات گئے ختم ہوا۔ ہم تھک گئے تھے۔ ہوسٹل میں آتے ہی اپنے بستروں پر پڑ گئے۔ ابن انشاء حسب عادت نیم گرم پانی کے غرارے کرنے لگا۔ میں نے اُس کی غرغراہٹ سے تنگ آ کر کہا۔

"یار تم نے کیا پکا راگ شروع کر رکھا ہے!"

وہ بولا۔

"سالے تم نے آج مجھے بڑے پان کھلائے ہیں۔ گلا درد کرنے لگا ہے۔"

ابن انشاء کو کبھی کبھی گلے کی شکایت ہو جایا کرتی تھی۔ لاہور میں، میں نے اُسے اکثر نیم گرم پانی کے غرارے کرتے یا گلے میں گلیسرین لگاتے دیکھا تھا۔ اُسے

زیادہ اہمیت اس لیے نہ دی کہ گلے کی شکایت تو مجھے بھی ہو جایا کرتی تھی۔ ویسے مجھے یاد ہے ایک بار میں نے اُس سے پوچھا تھا۔

"تمہیں گلے تو نہیں پڑ گئے۔ میرا مطلب ہے ٹانسلز تو نہیں ہیں؟"

اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں پیارے۔"

ابراہیم جلیس بڑے زوروں کے خرّاٹے لے رہا تھا۔ انشاء نے گرم پانی کا خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"سالا یا تو یہ خواب میں کسی کو ڈرا رہا ہے یا خود ڈر رہا ہے۔"

"اس کے خرّاٹے بند کراؤ۔"

ہم نے ابراہیم جلیس کو بازوؤں سے پکڑ کر پلنگ پر بٹھا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر بولا۔

"یہ ابھی شور کیسا ہو رہا تھا؟"

"یہ کمینے تو خرّاٹے لے رہا تھا۔"

جلیس کروٹ بدل کر پھر سو گیا اور تھوڑی دیر بعد پھر خرّاٹے لینے لگا لیکن اُس وقت ہم سو چکے تھے اور شاید ہم بھی خرّاٹے لے رہے تھے۔ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر جلیس محکمے کے دفتر کسی کام سے چلا گیا۔ میں نے انشاء سے کہا۔

"یار ریحانہ کے لیے ایک ساڑھی خریدنی ہے۔ میرا خیال ہے قرۃ العین حیدر کو ساتھ لے کر نیو مارکیٹ چلتے ہیں۔ وہ کوئی دلکش سا رنگ ہمیں تلاش کر دے گی کیونکہ ساڑھیوں کے معاملے میں ہم دونوں صفر ہیں۔"

انشا کہنے لگا۔

"میں تمہیں شہدی لے کر دے سکتا ہوں۔ ساڑھی خریدنی ہے تو عینی کو ہی ساتھ لے جانا پڑے گا۔ اس کا ذوق بہت اچھا ہے۔"

ہم نے قرۃ العین حیدر کو ساتھ لیا اور نیو مارکیٹ آ گئے۔ یہاں دکانوں میں ساڑھیوں کے انبار لگے تھے۔ دکاندار قیمتی سے قیمتی ساڑھی دکھا رہے تھے اور ہم سستی سے

سستی ساڑھی کی تلاش میں تھے۔ آخر عینی صاحبہ نے ہمیں ایک ساڑھی لے دی۔ اس ساڑھی میں مدراس کے رنگ غالب تھے جو مجھے بھی بہت پسند ہیں۔ یعنی گیروا، سیاہ اور سُرخ۔ کچھ نوادرات انشا نے خریدے۔ پھر ہم ایک ریستوران میں بیٹھ کر کافی پینے لگے۔ کاؤنٹر کے اوپر زرد کیلوں کے گچھے لٹک رہے تھے اور بانس کی ایک خوبصورت ٹوکری میں دو چار اناناس بھی پڑے تھے۔ میں نے قرۃ العین سے کہا۔

"یہ برمی کیلا ہے۔ بڑا میٹھا ہوتا ہے۔"

ابن انشا نے کہا۔

"ہمیں کھلاؤ گے تو جانیں گے۔"

میں نے کچھ کیلے اور اناناس لانے کو کہا۔ بنگالی نوکر نے ٹوکری میں سے ایک اناناس شاخوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ اُسے بڑی سی پلیٹ میں رکھا اور تیز چھرے سے بڑی مہارت کیساتھ اس کی چھال اتار ڈالی اور پھر قتلے بنا کر پلیٹ میں سجا ہمارے آگے لا رکھا۔ قرۃ العین نے کہا۔

"اس کی خوشبو بڑی گہری ہے؟"

"برما میں اناناس گہرے گولڈن کلر کے ہوتے ہیں۔"

ابن انشا کہنے لگا۔

"ناصر کاظمی کہتا ہے کہ ناشتے پر صبح مجھے اناناس نہ ملے تو میں گھر سے باہر نہیں نکلتا۔"

قرۃ العین نے مسکرا کر کہا۔

"کیا واقعی؟"

میں نے کہا۔

"ناصر کاظمی کرشن نگر میں رہتا ہے۔ وہاں اسے مہاراج کرشن تو مل سکتے ہیں مگر اناناس کبھی نہیں مل سکتا۔"

"ویسے بات اس نے خوبصورت کہی ہے۔"

"ناصر کاظمی کے شعروں میں اناناس کی خوشبو ہوتی ہے۔"

"رات مشاعرے والی اسکی غزل بہت پیاری تھی۔ بارشوں، دریاؤں، پھولوں کا شاعر۔ خدا اُسے لمبی عمر دے۔"

قرۃ العین حیدر کی دعا بھی ناصر کاظمی کو ملک عدم کے سفر سے نہ روک سکی اور ہمارے دیکھتے دیکھتے بارشوں، دریاؤں، پھولوں اور کوئلوں کی صداؤں کے ساتھ ساتھ اَن دیکھے جزیروں کو سفر کر گیا۔

عجیب مانوس اجنبی تھا
مجھے تو حیران کر گیا وہ

ڈھاکہ میں رمنا کے میدان میں نمائش لگی تھی۔ شام کو ہمارے ادیب شاعر دوست تو ریل میں بیٹھ کر چٹاگانگ کی طرف روانہ ہو گئے اور میں، ابن انشا اور جلیس نمائش دیکھنے چل دیے۔ ہر سٹال بہترین انداز میں سجایا گیا تھا۔ کہیں ایک بڑی کشتی بنی تھی۔ کہیں جھونپڑی برقی قمقموں سے جگمگا رہی تھی۔ بنگالی عورتیں، مرد اور بچے سیر کر رہے تھے۔ ٹھنڈی خنک ہوا چل رہی تھی۔ عارضی ریستورانوں میں ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ بنگالی گانوں کی تانیں اُڑ رہی تھیں۔ بالوں کے جُوڑے مہک اڑا رہے تھے۔ پیشانیوں کے تلک دہک رہے تھے۔ آوازیں، چہرے اور آنکھیں بنگال کے سحر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ریشمی ساڑھی سرسراتی ہوئی قریب سے گزر جاتی تو کبھی ناریل کی مہک آتی، کبھی اناناس کی خوشبو آتی اور کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے کسی گھنے جنگل کے پرانے مندر میں کوئی دیوداسی اپنے دیوتا کے چرنوں میں عود و عنبر سُلگا رہی ہے۔ یہ سب کچھ ایک خواب لگ رہا تھا۔ اور آج سچ مچ ایک خواب ہو کر رہ گیا ہے۔ کہاں چلے گئے وہ لوگ جو منہ اندھیرے کشتیوں کے بادبان دریاؤں، سمندروں کے سینے پر کھولتے تھے؟ جو دریا کے ایک کنارے پر کھانا پکاتے اور دوسرے کنارے پر جا کر کھاتے تھے؟ جو

سانپوں کے بلوں میں ہاتھ ڈال کر قیمتی پتھر نکالتے تھے۔ جن کی بھٹیالی کی دلگداز تانیں میگھنا، پدما اور کرنافلی کی لہروں کے ساتھ ساتھ سفر کرتی تھیں اور جہاں لمبے بالوں والی سیاہ چشم دیوداسیاں جُوڑے میں رجنی گندھا کے سفید پھول سجا کر گھر سے نکلتی تھیں۔ آہ! وہ ناریل کے سبز جھنڈوں میں سرگوشیاں کرتی جنوب مشرقی ایشیا کے سمندروں کی مرطوب ہوائیں۔ سلہٹ کے چائے کے باغات کی ہری بھری ڈھلانیں اور سندر بن کے جنگل میں سُنبل کے سرخ پھولوں بھرے درخت۔ اور وہ گیت گاتی اروتی بیراگن کا حسین چہرہ جس کے حسن بے مثال نے ہر ایک پر جادو کر دیا تھا! ——

زخمی ہرن کی پکار آج بھی سندر بن کی وادیوں میں گونج رہی ہے۔

نہ دیکھی لام تار چندر مُوکھ
نہ کہی لام سینہ رسیر کتھا رے
کی ٹھیل ماری لی بھائی تیر انداز رے
(نہ جی بھر کر دیکھ پائی اسکا چاند سا مکھڑا
نہ جی بھر کر اُس سے پیار کی باتیں کر پائی
کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا تو نے۔
او بھائی تیر انداز!)

سوچتا ہوں اب تو کبھی ابن انشا اور ابراہیم جلیس کے ساتھ سندر بن نہ جا سکوں گا۔ کبھی ان کے ساتھ رانگامتی کے ریسٹ ہاؤس میں بیٹھ کر چائے نہ پی سکوں گا۔ اور چکمہ قبیلے کی عورتوں کو رقص کے دائروں میں گم ہوتے نہ دیکھ سکوں گا۔ مینہ برسے گا، بادل گھر گھر کر آئیں گے۔ رانگامتی ریسٹ ہاؤس کی چھت سے ٹپاٹپ پانی کی بوندیں گریں گی۔ مینہ کی پھواریں گل مہر کے سرخ پھولوں کا منہ دھلائیں گی اور دور نیچے کرنافلی کے سبز پانیوں پر کھلے ہوئے کنول کے سفید پھول مہکیں گے۔ ناریل اور تاڑ کے اونچے اونچے درختوں کی جھومتی شاخیں

ہمیں دور سے اشارے کریں گی۔ ہمیں اپنے پاس بلائیں گی۔ ابن انشا کو آوازیں دیں گی۔ مگر کوئی ان کے پاس نہیں جائے گا۔

زخمی ہرنی کی پکار جانے کب تک ان جنگلوں میں گونجتی رہے گی؟

رات کے پچھلے پہر میں ڈھاکہ سے پرواز کر گیا۔

ابن انشا میرے جانے کے ایک یا دو روز بعد ڈھاکہ سے سیدھا کراچی چلا گیا۔ میں لاہور آگیا تھا۔ اس کے بعد ابن انشا سے جب وہ لاہور آتا تو ملاقات ہوتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ مجھ سے ملے بغیر واپس کراچی چلا جاتا۔ اگلی بار ملتا تو کہتا۔

"بہت مصروف تھا اس لیے ملنے نہ آسکا۔"

ابن انشا اب واقعی بہت مصروف رہنے لگا تھا۔ آج یوگنڈا میں ہے تو کل جاپان کی طرف اڑا جا رہا ہے۔ آج گوئٹے مالا کے اوپر سے گزر رہا ہے تو کل پیرس یا کوپن ہیگن کے کسی کیفے میں کافی پی رہا ہے۔ مجھے اس پر رشک آتا تھا۔ میں اُسے کہا کرتا تھا کہ ابن انشا، تم ایک اعتبار سے قابل رشک ہو کر ملک کی سیریں کرتے پھرتے ہو لیکن ایک اعتبار سے بد قسمت ہو کہ پیرس اور کوپن ہیگن میں بیٹھ کر بھی چائے پیتے ہو۔

"کم بخت اور کچھ نہیں تو ٹھنڈی سنہری بیئر کے ہی دو گلاس پی لیا کرو۔"

مگر ابن انشا ان چیزوں سے بہت آگے تھا۔ یا بہت پیچھے تھا۔ ایک بار میں بیئر خریدنے گیا تو وہ میرے ساتھ تھا۔ میں جب کبھی فرنچ وائن والوں سے

بیئر خریدنے جاتا تو پہلے فیروز سنز کی دکان سے انگریزی اخبار "لیڈر" خریدتا۔ پھر بیئر کو اس میں اچھی طرح لپیٹ کر ایسے لے جاتا جیسے اخبار لے جا رہا ہوں۔ کاؤنٹر والا یہ سمجھتا کہ میں اخبار "لیڈر" کا زبردست مداح ہوں جو باقاعدگی سے وہاں آ کر صرف وہی اخبار خریدتا ہوں۔ اصل معاملہ یہ ہوتا کہ وہ اخبار بڑے سائز کا تھا۔ اور اس میں بیئر کی بوتل بڑی آسانی سے چھپ جاتی تھی۔ ابن انشا کو میری اس عادت کا علم تھا چنانچہ اس روز بھی وہ میرے ساتھ تھا۔ ہم فیروز سنز کی دکان میں داخل ہوئے اور سیدھے اس کاؤنٹر پر گئے۔ جہاں ہمارا مطلوبہ اخبار رکھا تھا۔ ابن انشا نے اخبار اٹھا کر دیکھا اور کہا۔

"بھئی واہ! آج تو اس نے بڑی زبردست سرخی جمائی ہے۔"

"اچھا! ذرا دکھانا تو۔"

اور ہم دونوں اس کی سرخیوں پر یوں بحث کرنے لگے جیسے بڑے پرانے سیاست دان ہوں۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم میں سے کسی نے بھی اس کی کوئی سرخی غور سے نہیں پڑھی تھی۔ میں نے ایک آنہ دے کر اخبار خرید کر بڑی احتیاط سے بغل میں دبایا اور ابن انشا کو لے کر فرنچ وائن والوں کی دکان پر آ گیا۔ ابن انشا نے کبھی میرے ساتھ اس دکان پر جاتے ہوئے برا محسوس نہیں کیا تھا، چنانچہ اس روز بھی جب دکاندار نے بیئر کی بوتل دی تو ابن انشا نے ہی میرے لیے بڑی احتیاط سے بلکہ بڑے کمال سے اخبار میں لپیٹا اور پھر مجھے پکڑا دی۔ ہاں بوتل کے پیسے ضرور میں نے ادا کئے۔ اس کے بعد جب میں نے بیئر پینا چھوڑ دی تو اس نے مجھے خط میں لکھا کہ "سنا ہے آجکل لاہور میں "لیڈر" اخبار کی اشاعت گر گئی ہے؟ ارے تف ہے تجھ پر! فیروز سنز والا کاؤنٹر بوائے کیا سوچتا ہوگا؟"

ایک روز مجھے ریڈیو اسٹیشن پیغام ملا کہ ابن انشاء کا فون آیا تھا۔ میں نے نیشنل بک سنٹر فون کیا تو ابن انشا بول رہا تھا۔

"ہاں میں نے فون کیا تھا۔ بس آجاؤ۔"

میں وہ ایک ضروری کام جلدی جلدی نمٹا کر نیشنل بک سنٹر کے دفتر پہنچ گیا۔ ابن انشا وہاں ذوالفقار تابش کی میز پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کے بالوں میں تازہ تازہ خضاب لگا تھا اور اس کے گلے بھاری بھاری تھے۔ جسبِ معمول ہم نے گالیوں سے ایک دوسرے کا خیر مقدم کیا:

"حرامزادے تم ریڈیو والوں کو بے وقوف بناتے ہو۔ جب فون کرو نہیں ملتے۔ کوئی کہتا ہے ابھی یہاں تھے۔ کوئی کہتا ہے وہاں تھے۔ یہ بتاؤ تم ہوتے کہاں ہو؟"

میں نے کہا۔

"یار یہ تمہارا گلا کیوں سوجا ہوا ہے؟"

گردن ہلا کر بولا۔

"کمینے پہلے میرے سوال کا جواب دو۔"

میں نے دیکھا کہ ابن انشا کے سر کے بال کافی پتلے ہو گئے تھے۔ ماتھا تو بالکل صاف ہو گیا تھا جو پہلے کبھی قدرتی سیاہ بالوں سے بھرا ہوتا تھا۔ نچلا ہونٹ موٹا ہو گیا تھا اور گلے بوجھل ہو کر ڈھلک رہے تھے۔ جسم پہلے سے بھاری اور موٹا ہو گیا تھا، لیکن شکل سے لگتا تھا کہ وہ صحت مند نہیں رہتا۔ میں نے اُس کے ہونٹوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"تم باہر کے ملکوں میں جا کر زیادہ تر بگل تو نہیں بجاتے؟"

پھر میں نے اُسے ایک لطیفہ سنایا کہ ایک امریکی نیا نیا ویٹ نام میں ایک طوائف کے پاس گیا۔ اس کا منہ اس قدر خوفناک انداز میں چوما کہ طوائف دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ پھر امریکی سے پوچھنے لگی،

"تم فوج میں کیا کرتے ہو؟"

امریکی نے کہا۔

"میں فوجی بینڈ میں بگل بجاتا ہوں۔"

اس پر ابن انشا بڑا ہنسا اور مجھے بے نقط سنانے لگا کہ کمینے تم مجھ سے جلتے ہو۔ میں نے تو آج تک کسی عورت سے یہ نہیں کہا کہ میں بگل بجاتا ہوں۔

چائے آ گئی۔ میں نے کہا۔

"یار آج تو جی چاہتا ہے لارنس باغ چل کر چائے پی جائے۔"

وہ عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے آنکھیں گھما کر بولا۔

"ارے میں تمہاری طرح کوئی بیکار تو نہیں ہوں۔ چل چپکے سے چائے پی۔ اچھا لو تمہیں ایک بڑھیا سگریٹ بھی پلاتا ہوں۔"

پھر اس نے اپنے بریف کیس میں ایک کنگ سائز کا فلٹر سگریٹ نکال کر مجھے دیا۔

"یاد رہے، اس کے ایک دو کش میں بھی لگاؤں گا۔"

لارنس باغ کے درختوں سے وہ دور ہو گیا تھا۔ اب اسے املتاس کے زرد پھولوں کی مہک بھی اپنی طرف نہیں کھینچتی تھی۔ کبھی وہ میرے ساتھ لارنس باغ کی روش پہ چلتے ہوئے کوئی زرد پتا یا کسی چڑیا کا پر اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیا کرتا تھا لیکن اب اس کی جیب بریف کیس میں آ گئی تھی۔ جس میں بڑے ہی قیمتی بڑے ہی بیکار کاغذات، ہر سائز کی چیک بکیں، بل، چھوٹی بڑی فائلیں، ٹیلی فون نمبروں سے بھری ہوئی ڈائریاں اور الا بلا دواؤں کی شیشیاں بھری رہتیں۔ کبھی کوئی شیشی کھول کر گولی پانی سے نگلتا۔ کبھی کسی شیشی کا ڈھکنا کھول کر ناک میں یا گلے میں قطرے ٹپکانے لگتا اور کبھی سبز سرخ نیلے پیلے رنگ کے کیپسول کو ہتھیلی پر رکھ کر غور سے تکتا اور پھر حلق میں اتار لیتا۔ جتنی دیر میں اس کے پاس بیٹھا چائے پیتا رہا وہ برابر فون کرتا رہا۔ کبھی کراچی، کبھی حیدر آباد اور کبھی اسلام آباد۔ ساتھ ساتھ مجھ سے بھی باتیں کئے جا رہا تھا۔ اسکی چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ میرا سگریٹ ختم ہو گیا۔ پھر اس نے گھڑی دیکھی اور ایک دم سے اٹھ

کر بولا۔

"مجھے ایک ضروری میٹنگ میں جانا ہے۔ شام کو ملوں گا۔ تم بے شک نو بجے کے بعد گھر پر آ جانا۔"

میں رات کو اس کے گھر گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ نہیں ہو گا۔ اگلے روز میں نے فون کیا تو پتہ چلا وہ شام کی فلائٹ سے کراچی گیا تھا کیونکہ رات تین بجے اُسے کراچی سے ہونولولو آئرلیس کے لیے ایک فلائیٹ پکڑنی تھی۔ میرے خیال میں ابن انشا کے سفر اتنے اور دلچسپ نہیں تھے جتنے دلچسپ اُس کے سفرنامے تھے۔ وہ ابن بطوطہ کے تعاقب میں ضرور نکلا تھا۔ مگر اس سے ابن انشا کی ملاقات نہ ہو سکی۔ ایک بار شیخ غلام علی پبلشرز کے دفتر میں اس سے اچانک ملاقات ہو گئی۔ ہم انارکلی کے ایک ریسٹورنٹ میں آ گئے۔ چائے منگوائی۔ دیر تک باتیں کرتے رہے میں نے محسوس کیا کہ اسکی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر اچانک گھڑی پر نگاہ ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب چلنا چاہیے۔ مجھے ایک ضروری میٹنگ میں جانا ہے۔"

اب تو انشا سے ملاقات ایسے ہی ہوا کرتی، اچانک اور مختصر۔ کبھی مہینے بعد، کبھی سال بعد۔ پھر پتہ چلا کہ ٹوکیو علاج کے لیے گیا ہے۔ یہ بڑی خفیہ خبر تھی جس کا لاہور میں شاید دو ایک آدمیوں کو علم تھا۔ واپسی پہ لاہور رکا تو میں نے فون پر اس سے پوچھا کہ خیریت تھی؟

"یہ کسی دشمن نے خبر اڑائی ہو گی۔ ارے مجھے کیا ہو گیا ہے؟ بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

اسکی موت کے بعد معلوم ہوا کہ خبر سچی تھی۔ وہ ٹوکیو چیک اپ کروانے گیا تھا اور وہیں ڈاکٹروں نے اس کے مہلک مرض کی نشان دہی کر دی تھی۔ مگر ابن انشا نے کسی کو نہ بتایا کہ اسکی زندگی کے دن پورے ہونے کو ہیں۔

ابن انشا سے میری آخری ملاقات میرے سمن آباد والے مکان پر ہوئی۔

یہ ملاقات بھی اچانک تھی۔ میرے ہاں کوئی تقریب تھی۔ مہمانوں کو رات کے کھانے پر بلایا ہوا تھا۔ مہمان کھانا وغیرہ کھا کر جا چکے تھے۔ گھر میں برتن وغیرہ سمیٹے جا رہے تھے۔ شروع سردیوں کا موسم تھا۔ میں صحن میں دیگ کے پاس کھڑا زردے کی کھرچن اتروا کر پلیٹ میں ڈال رہا تھا کہ باہر ایک گاڑی آکر رکی۔ بڑے بلب کی روشنی میں مجھے گاڑی میں سے ابن انشا باہر نکلتا نظر آیا۔ میں پلیٹ تپائی پر رکھ کر اس کی طرف بڑھا۔

"تم لاہور میں تھے تو مجھے بتایا کیوں نہیں؟ مجھے کتنی خوشی ہوتی جو تم بھی دعوت میں شریک ہوتے۔"

وہ اپنے خاص انداز میں مسکراتا ہوا اندر آ کر ڈرائینگ روم میں بیٹھ گیا۔ پرانے قالین پر خوبصورت مہمان لڑکیوں کے جوڑے سے گری ہوئی گلاب کی سرخ پتیاں ابھی تک بکھری پڑی تھیں۔ کمرے کی فضا بریانی، زردے، گلاب کے پھولوں اور قسم قسم کے اعلیٰ پرفیومز کی خوشبوؤں سے بوجھل سی تھی۔ ابن انشا صوفے کے کونے میں بیٹھ گیا۔ میں نے ریحانہ سے کہا۔

"کھانا لے آؤ۔"

"بھئی کھانا تو میں کھا کر آیا ہوں۔ کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

"تو پھر زردہ کھا لو۔ تم پسند کرو گے۔ خالص کشمیری زردہ ہے۔"

"ہاں البتہ تمہارے گھر کا زردہ ضرور چکھ لوں گا۔"

ریحانہ نے زردہ پلیٹ میں ڈال کر دیا۔ ابن انشا نے ایک چمچ منہ میں ڈالا اور بولا۔

"بھئی زردہ تو بہت کمال کا ہے مگر یہ بھی بتاؤ کہ تقریب کیسی تھی؟"

ریحانہ اس سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے مسعود سے ٹھنڈا پانی لانے کو کہا۔ پھر سگریٹ سلگا کر ابن انشا کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ میں آخری بار ابن انشا کو دیکھ رہا ہوں۔

"تم لاہور میں تھے تو مجھے ریڈیو سٹیشن کم از کم فون ہی کر دیتے۔"

ابن انشا پانی پی رہا تھا۔ گلاس رکھ کر بولا۔

"ارے میں تو آج ہی آیا ہوں۔ آج ہی جا رہا ہوں۔ رات گیارہ بجے کی فلائیٹ پر۔ سوچا تم سے ملتا جاؤں۔ زردہ مزے دار ہے۔"

مجھے ابن انشا کے آنے کی بے حد خوشی ہوئی تھی۔ دعوت میں بڑے بڑے مسیحاؤں اور خضراؤں سے ملاقات کر چکا تھا۔ لیکن میرا ہمدم دیرینہ آیا تو اُن میں سے کوئی بھی یاد نہ رہا۔ بس ابن انشا کو دیکھتا۔ ایک ہلکی سی گالی دیتا۔ مسکراتا اور سگریٹ پینے لگتا۔ وہ خود بھی زردہ کھاتے ہوئے مجھے مسکرا کر دیکھتا۔ ایک چھوٹی سی گالی دیتا اور پھر مسکرانے لگتا۔ نہ اُسے خبر تھی کہ وہ مجھے آخری بار گالی دے رہا ہے۔ آخری بار دیکھ رہا ہے۔ نہ مجھے خبر تھی کہ میں اس کے بعد اُسے کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔

ابن انشا نے بہت تھوڑا زردہ کھایا۔ ریحانہ کشمیری قہوے کے دو پیالے لے آئی۔ یہ پیالے وہ دو روز پہلے رنگ محل سے خرید کر لائی تھی۔ اُن پر بڑی نازک نیلے رنگ کی کلیاں بنی تھیں۔ شاید چیکوسلاواکیہ کے تھے۔ ابن انشا نے پیالیاں دیکھ کر کہا۔

"کڑیے ریحانہ! بھئی ایسی پیالیاں ہمیں بھی لا دو کہاں سے خریدی ہیں یہ؟"

ریحانہ نے کہا۔

"آپ یہی لے جائیں۔"

ابن انشا مسکرایا اور کنکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"چلو اس سے کم از کم یہ فائدہ تو ضرور ہو گا کہ تم دوبارہ خرید کر لانے کی زحمت سے بچ جاؤ گی۔"

مسعود نے کہا۔

"انکل آپ ہماری دعوت میں کیوں نہیں آتے؟"

ابن انشاء نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"یہاں آتے ہی رہتے ہیں۔ اصل میں تمہارے ابا کے ساتھ ہمارا دعوتوں کا معاملہ "وٹے سٹے" کا ہے۔ کبھی یہ ہمیں دعوت میں بلالیتے ہیں اور کبھی ہم ان کی دعوت میں آجاتے ہیں۔"

بس یہی کوئی بیس پچیس منٹ میں یہ آخری ملاقات ختم ہوگئی۔ تیس اکتیس سالوں کا ایک ساتھ کا سفر بس یہی بیس پچیس منٹ میں ختم ہوگیا۔ اپنی کراچی والی عادت کے مطابق اس نے کلائی کی گھڑی دیکھی اور ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"بس بھئی اب چلے۔"

وہ گاڑی میں پچھلی سیٹ پر جاکر بیٹھ گیا۔ گاڑی کا انجن سٹارٹ ہوا۔ ابن انشا نے میری طرف دیکھ کر، ذرا گردن جھکا کر مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ گاڑی آگے بڑھی اور راہ چمن کا موڑ کاٹ کر غائب ہوگئی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ پھر کبھی ابن انشا کو میرے گھر نہ لانے کے لیے۔ سوچتا ہوں اگر وہ پیدل میرے گھر سے جاتا تو شاید مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا نہ ہوتا۔ لیکن یہ تو میری سوچ ہے۔ ابن انشا سے محبت کرنے والے کی سوچ۔

پیدل چلنے والے کی سوچ!

مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ابن انشا جو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہاتھ ہلا کر مجھ سے رخصت ہو رہا ہے ــــــ پھر کبھی مجھ سے ملنے نہیں آئے گا۔ اور میں اگر زمین کے ساتھ ساتھ سورج کے مدار کے اربوں چکر بھی لگاؤں گا تو اسکا مسکراتا ہوا چہرہ نہ دیکھ سکوں گا۔

اب عجیب عجیب خبریں آنے لگیں۔ کسی نے کہا ابن انشا بہت بیمار ہے۔ ابن انشا لندن میں ہے۔ ابن انشا لندن کے ہسپتال میں ہے۔ اُسے کینسر ہو گیا

ہے۔ میں نے اُسے لندن خط لکھا۔ اس کے لیے دُعا کی۔ اُس نے مجھے اپنا آخری خط لکھا۔ تم کیوں فکر کرتے ہو؟ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ تمہیں میری بیماری کی فکر ہوئی ہے تو اب مجھے بھی تشویش لگی ہے۔

میں جواب دینے کے لیے سوچ ہی رہا تھا کہ اخبار میں خبر آئی ابن انشاءؔ کی حالت نازک ہوگئی اور پھر ایک روز میں نے اخبار میں ایک تابوت دیکھا جس کے شیشے سے ابن انشاؔ کا خاموش چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ املتاس کے گلابی پھول تو گرمیوں کی دوپہروں میں بڑی تیز خوشبو دیتے ہیں۔ ابھی کل میں لارنس باغ گیا تو املتاس کے اس درخت کو دیکھا جسکی زرد چھاؤں میں ابن انشاؔ اور میں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ قہقہے لگایا کرتے تھے۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی خوبصورت نظمیں سنایا کرتا تھا۔ املتاس کی شاخوں میں زرد پھولوں کے فانوس لٹک رہے تھے۔ سورج ذرا اوپر آیا تو اس کی کرنوں نے زرد پھولوں کو روشن کر دیا اور اُن کی گرم خوشبو دھوپ میں اڑنے لگی۔ میں نے ہاتھ سے ٹہنی کو نیچے جھکایا اور زرد پھولوں سے پوچھا۔

"تم نے ابن انشاؔ کا تابوت دیکھا ہے؟"

پھولوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُن کے نازک مکھڑے تیز دھوپ میں اور زرد ہو گئے اور پھر گرم ہوا میں اُن کی زرد خوشبو گہری اداس ہو گئی۔ میں نے ہوا سے کہا اُسے دیکھنا وہ کہاں ہے؟ میں نے سوکھے پتوں سے کہا۔ اُس کی کوئی خبر لانا۔ میں نے خوشبو سے کہا۔ اُسے تلاش کرنا۔ ہوا گزر گئی۔ سوکھے پتے ہوا کے ساتھ اڑ گئے اور خوشبو واپس نہیں آئی۔ اب کون اسکی خبر لا کر دے گا؟

املتاس کے زرد پھولو! میرے ساتھ تم بھی طلوع ہوتے سورج کی طرف اپنا چہرہ اٹھاؤ! روشنی! زرد روشنی! اور زرد روشنی!!

لاہور
۲۲ مارچ ۱۹۶۹ء

پیارے حمید

تم کہو گے - پھر دیر کر دی - ہاں بھئی پھر دیر ہو گئی - موقع اور موڈ کی تلاش کرتے دیر ہو گئی - اور بغیر موڈ کے خط لکھ رہا ہوں لیکن لکھ تو رہا ہوں - اتنا تھوڑا ہے - لاہور کوئی مری تو نہیں ہے کہ ہفتہ بھر سے آسمان ابر آلود ہو - مینہ لگاتار برس رہا ہو اور سردی کافی تکلیف دہ ہو - یہاں تو عجیب و غریب قسم کا موسم ہے - موسم کا احساس ہی نہیں ہوتا - تم جو یہاں نہیں ہو - دن اور رات اداس سے گزرتے ہیں - آجکل لارنس میں اور مال پر گھومنے کا مزا ہے - کل رات دس بجے حمید اختر جلیس اور صفدر آ گئے - اُن کے ساتھ باہر جا کر نان کباب کھائے - کیفے میں کافی پی - اور اس کے بعد گھومتے رہے - بارہ بجے تک گپیں ہانکتے رہے - اور ہنستے اور کھیلتے کودتے رہے - پھر صفدر کو کوئی کام یاد آ گیا اور چلا گیا - میں نے حمید اختر اور جلیس کو تھوڑی دیر روکا - لیکن پھر وہ بھی چلے گئے - اور میں اکیلا رہ گیا اور دل اداس ہو گیا -

پھر تم پتھر پر بیٹھ کر ناول پڑھنے لگے - دھوپ جسم کو پر سکون گرمی بخش رہی تھی - نیچے پھیلی ہوئی وادیوں میں سفید ابر پارے تیر رہے تھے - اور چیڑ کے گنجان جنگلوں کی طرف سے آنے والی ہوا میں خنکی تازگی اور ہلکی خوشبو تھی - لیکن وہ تازگی اور خوشبو یہاں تک نہیں پہنچتی - تم اس خوشبو اور تازگی کے مزے لوٹ رہے ہو - خیر اچھا ہے - لیکن تم آؤ تو یہ تازگی اور یہ خوشبو جو بہار اور امید کی نشانیاں ہیں اپنے ساتھ لے کر آنا - اپنے ساتھ لے کر آنا -

۲۰ تاریخ کو کراچی میں یوم غالب ہے اور یہ لوگ وہاں جا رہے ہیں۔ کون لوگ۔ صفدر۔ قاسمی۔ جلیس۔ قتیل اور ظہیر وغیرہ۔ اس ہفتے ہمارے اجلاس کی صدارت مولانا چراغ حسن حسرت کر رہے ہیں۔ اور ایوب کرمانی ایک طنزیہ مضمون پڑھیں گے اور میں ایک نظم پڑھوں گا۔ شنگھائی والی نظم ابھی پوری نہیں ہوئی۔ میں جو نظم پڑھ رہا ہوں وہ آج سے کوئی چار سال پہلے لکھی گئی تھی۔ لیکن آج کے حالات میں اس کا اطلاق زیادہ اچھی طرح ہوتا ہے۔ یہ پین اب چلنے لگا ہے۔ یہ پین بھی میں نے خاص طور پر یہ خط لکھنے کے لیے کسی سے مستعار لیا ہے۔ پرپول سے مستعار رکھا ہے۔

دو تین دن ہوئے۔ مغربی پنجاب کی انجمن ترقی پسند مصنفین کا انتخاب ہوا ہے۔ احمد ندیم قاسمی جنرل سیکرٹری چنے گئے ہیں۔ عبداللہ ملک آرگنائزنگ سیکرٹری اور عارف خزانچی۔ بہت اچھا انتخاب ہوا ہے۔ بھٹی اور عبدالسلام خورشید وغیرہ نکل گئے ہیں اور اُن کی جگہ ظہیر وغیرہ کو لیا گیا ہے۔ چند دن تک لاہور کی انجمن کا بھی انتخاب ہونے والا ہے۔ تاریخ کا ابھی تعین نہیں ہوا۔ ملک وغیرہ کا خیال ہے کہ سیکرٹری صفدر کو اور تمہیں بنا دیا جائے۔ اس میں میری CONVASSING کو کوئی دخل نہیں۔ صاف بات ہے۔ اب

یہ ہے کہ تم آؤ تو پتہ چلے کہ تم کہاں رہو گے۔ اور ذمہ داری کے کام کرو گے کہ نہیں۔ میرے لیے سب سے بڑی بد خبری یہ ہے کہ ہمارا دفتر شاید جون تک کراچی منتقل ہو جائے۔ میری کوشش اب بھی یہی ہے کہ یہاں میرے لیے کوئی روزگار کی سبیل نکل آئے تو نوکری چھوڑ کر یہیں رہ جاؤں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے روزگار کی کوئی سبیل یہاں نکلے گی نہیں اور مجھے طوعاً و کرہاً جانا پڑے گا۔

اور سب دوستوں سے ایک مستقل جدائی ہو جائے گی۔

ہاں جانِ من۔ میں مارچ کی ۲۶ تاریخ کے لیے چشم براہ ہوں۔ آج ۱۶ ہے اور تمہارے آنے میں سات آٹھ دن کا وقفہ ہے بشرطیکہ تم اپنے پروگرام اور وعدے کے پابند رہو۔ میرے دوست ضرور آ جاؤ۔ شالامار باغ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اسی روز دیکھیں گے۔ تم تو پہلے بھی دیکھ چکے ہو اور اسی روز شورش نے بھی دکھا دیا تھا۔ اب کے پھر شورش نے چٹان میں جھک ماری ہے۔ لیکن چھوڑو جی۔ کون پروا کرتا ہے۔ میرا شنگھائی والا مضمون اس ہفتے کے نظام میں آ رہا ہے اور نظام نے ترقی پسند روش پر چلنا منظور کر لیا ہے۔ اس میں ہفتے کے ہفتے ہماری رپورٹ بھی چھپا کرے گی۔ اور باقی بھی کئی تبدیلیاں ہوں گی۔ (ان میں انتظار کی تبدیلی شامل نہیں ہے۔)

ماہر نے تمہاری جو تصویر کھینچی تھی۔ وہ میں بھیج رہا ہوں۔ بس معمولی قسم کی تصویر ہے۔ حفیظ نے جو تصویریں کھینچی ہیں وہ بہت اچھی ہیں۔

اچھا تو پیارے دوست۔ اب رخصت! میرا یہ خط بے رنگ و بو ہے لیکن رنگ و بو کہاں سے لاؤں۔ تمہارا انتظار ہے شاید تمہارے ساتھ رنگ و بو بھی آ جائے۔

ابن انشا

یہ ہے وہ نظم جو میں اب کے پڑھ رہا ہوں۔ اس میں طوفان عوامی تحریکیں ہیں اور ساحل وغیرہ رجعت اور سامراج کی نشاندہی کرتے ہیں۔

آج کا طوفان

موجوں کے مزاج ہیں دگرگوں
کچھ کر کے رہے گا آج جیحوں
شاید یہی آخری ہو طوفاں

ساحل پھر نہ ہو سکے نمایاں

جنباں ہوئی یم کی سطحِ خاموش
پیدا ہوا موجِ خفتہ میں جوش
لرزہ ہوا منبروں پہ طاری
ہیبت ہوئی گنبدوں میں ساری
رستے میں ہیں آ ہنیں چٹانیں
پیہم بڑھی آ رہی ہیں موجیں
ساگر نئی چال چل رہا ہے
طوفان نیا رُخ بدل رہا ہے۔

لیکن اے رفیق ہم نے اکثر
دیکھا ہے قیامتوں کو گھڑیاں
اٹھے ہیں نہ جانے کتنے سیلاب
سمجھے تھے جنہیں نجات ساماں
پسپا ہوئیں رفتہ رفتہ موجیں
ساحل ہوا دم بدم نمایاں
مرمر کے ستون قلاعِ خارا
تاراجِ خروجِ دیوِ طوفاں
تانے ہوئے سینے پھر سے ابھرے
پانی کے وسیع دامنوں سے

طوفاں کا تم آج رنگ دیکھو

ماضی کی کہانیاں نہ چھیڑو
آج اپنے شباب پر جنوں ہے
ہر قصرِ بلند سرنگوں ہے
پُشتوں کی گرانیاں مسلّم
پانی کی صفیں بھی ہیں منظّم
لرزہ سا ہے ہر بنا پہ طاری
ہیبت سی ہے گنبدوں میں ساری
پیروں سے نکل گئیں چٹانیں
پیہم بڑھی آ رہی ہیں موجیں

ساحل نے جتن کیے ہزاروں
روکے سے نہیں رُکے روانی
قلعوں کے وہ مرمریں منارے
ایامِ عتیق کی نشانی
مذہب کی وہ خانقاہیں جن سے
زندہ تھیں روایتیں پرانی
وہ سیم نگار قصر و ایواں
آیاتِ شکوہ و قہرمانی
دھرتی پہ پڑے ہیں سر بسجدہ
بڑھتا ہے مزے مزے سے پانی
موجوں کے مزاج ہیں دگرگوں
کچھ کر کے رہے گا آج جیحوں
شاید یہی آخری ہو طوفاں
ساحل پھر نہ ہو سکے نمایاں

[illegible]

کراچی
۳۰ مئی ۱۹۵۲ء

پیارے حمید!

تم بہت دنوں سے میری آنکھوں کے سامنے ہو۔ میرے دل میں بس رہے ہو۔ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں اس کی کئی وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ امروز میں ہفتے کے ہفتے "کتابوں کی دنیا" کا کالم لکھتا ہوں اور اب تک تمہارے ناول "جھیل اور کنول" کے علاوہ تمہارے ان افسانوں پر جو نقوش اور ادب لطیف میں چھپے ہیں تبصرے کر چکا ہوں۔

امید ہے اس ہفتے تمہارے ڈرامے پر تبصرہ کروں گا۔ تمہارا نیا ناول بڑا اچھا ہے۔ لیکن کئی پہلوؤں سے ڈرامہ مجھے زیادہ پسند ہے اور انہی پہلوؤں سے سماوات بھی۔ جزئیات نگاری اور ظرافت کے تم بادشاہ ہو۔ میلوڈراما بھی اچھا لکھتے ہو اور شفیق الرحمٰن کو مات پر مات دے رہے ہو لیکن میرے ایسے آدمی کو جس کی زندگی میں محبت کو کبھی دخل نہیں رہا۔ سہیلی کے نام قسم کی چیزیں کیسے پسند آسکتی ہیں؟ ہاں وہ تمہارا قبرستان سے خط جو ادب میں چھپا تھا یہاں بہت پسند کیا گیا ہے لوگوں نے اور تم سے کیا پردہ میں نے اس کا پراپیگنڈا بھی کافی کیا ہے پھر عجیب اتفاق ہے کہ جس وقت تمہارا یہ احمقانہ اور بیرنگ خط (حرامزادہ) ملا ہے اس وقت میں گورکی کی آپ بیتی کا دوسرا حصہ پڑھ رہا تھا اور وہ جہاں چیکا اور ٹیلا کا نام آتا ہے (تم نے غلط لکھ دیا ہے چخوف کا میرا نام ہے ننکا تمہارا۔ نوٹ کر لو) اور جہاں کالی بلی کو تر کھا گئی رے والا گیت ہے اور اس سے پہلے میں نے تمہارا رپورتاژ وادیاں ابھی ختم ہی کیا تھا۔ مجھے وہ بہت پسند آیا لیکن اپنی محرومی اور قید اور دوری پر آہ بھر کر اور کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ تم الو کے پٹھے ہو۔ لیکن تم سے میرا مزاج (اور قاعدہ)

کچھ ایسا ملا ہوا ہے کہ تمہیں دیکھ کر دل کا کنول فوراً کھل جاتا ہے۔ اگر تم لڑکی ہوتے اور میرے محلے میں رہتے تو میں تمہارے ساتھ شادی کرنے کے لیے ہزاروں جتن کرتا اور تم شادی نہ کرتے (یا نہ کرتیں) تو خودکشی کر لیتا — اور یہ شادی میں (اگر کرتا) تو یہ جانتے ہوئے کرتا کہ تم مجھ سے نکاح کے باوجود محلے کے بانکے چھبیلے نوجوانوں سے...... لیکن اب بات بڑھانے سے حاصل۔ تم چہکا کی زبان میں کہو گے۔ "بچو" یہ تو تیری گپ ہے۔ پر تو تو بے پر کی اڑا رہا ہے — لیکن اتنا کہوں کہ تم پر برقع سجتا بہت خوب اور میکلوڈ روڈ پر تم گزرتے (یا گزرتیں) تو احمد راہی کھنکارتا ضرور اور وہ شخص بھی جو "مجلہ نور" میں مستور ہے طوبیٰ سے بلند (ظہیر) تانگے میں تمہارا پیچھا ضرور کرتا۔ اور شام کو تم پٹانے کے لیے گو بھی چھیڑتے۔ سونے کے بندوں کے لیے تقاضے کرتے پکی روٹی اور جنگ نامہ کلاں پڑھتے۔ اور اپنی تین سالہ بچی کنیز فاطمہ اور چھ ماہ کے لڑکے نذیر (چودھری نذیر احمد کی طرف اشارہ نہیں) کو لے کر فلم دیدار کا مستورات کا ۳½ بجے والا شو دیکھنے جاتے......

اس سے تم پر واضح ہو جائے گا کہ جس قسم کے بعض میلوڈرامائی خط اور مضمون تم لکھتے ہو ویسے میں بھی لکھ سکتا ہوں۔

جھیل اور کنول کا ریویو امروز میں چھپا تو یہ غضب ہوا کہ کاتب نے سب جگہ "جھیل اور کنول" لکھ دیا اور مجھے غصے میں آکر امروز میں ایک خط لکھنا پڑا۔ اس کاتب نے مندر کو منڈر بھی لکھا تھا۔ جس پر میں نے بہت غدر مچایا اور امروز کے کاتب مجھ سے ناراض ہو گئے — کل میں نے تمہارا رپورتاژ وادیاں پڑھنے کے بعد مولوی عبدالغنی نیازی ایم اے (اردو) ایم اے (فارسی) سابق پروفیسر ناگپور کالج اور سابق پرنسپل اردو کالج کو پڑھنے کو دیا۔ وہ میرے COLLEAGUE ہیں۔ میرے دائیں

ہاتھ بیٹھتے ہیں اور میں نے تمہارا بیرنگ خط انہی سے تین آنے قرض لے کر چھڑایا تھا۔ داویاں پڑھ کر وہ ناک بھوں چڑھا کر بولے (ان کی عمر ۵۳ سال ہے اور داڑھی شرعی ہے) اس میں مستقل VALUE کی کوئی چیز نہیں ہے۔ کوئی تعمیری بات نہیں کیا فائدہ ایسی باتیں لکھنے سے۔ خود وہ نعتیں لکھتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار کے مرثیے لکھتے ہیں۔ اقبال کے کلام میں تصوف کے موضوع پر ایک مقالہ تصنیف فرما رہے ہیں۔ کراچی آؤ تو ملاقات کراؤں۔

تم ادب کے میدان میں چوکڑیاں بھرتے ہوئے آگے بڑھتے جاتے ہو اور میں اتنا پیچھے رہ گیا ہوں کہ اس سال کچھ نہ لکھا تو فخریہ لوگوں سے کہا کروں گا "یہ شخص اے حمید۔ یہی جو مشہور افسانہ نگار ہے۔ میرا بہت اچھا دوست ہے۔ بس میرے سامنے اس نے لکھنا شروع کیا بلکہ شروع شروع میں تو مجھ سے اصلاح بھی لیتا رہا ہے۔ اچھا لڑکا ہے۔ اور ترقی کرے گا۔ اس کا اکثر وقت میرے مکان پر گزرتا تھا۔ فلاں افسانے کا پلاٹ میں نے اسے بتایا تھا اور اس میں جس باغ کا تذکرہ ہے وہ وہ باغ ہے جو ہمارے گھر کے پیچھے ہے ـــــ وغیرہ"۔

مجھے انتظار حسین بھی پسند ہے جو سر پہ توا باندھ کر ٹھیک دوپہری میں افسانے لکھتا ہے اور املی کے پتے پر ڈسٹرپیل کر شفیا اور رفیا قسم کے غیر فانی کردار تخلیق کرتا رہتا ہے۔ تمہیں یہ سن کے تعجب ہوگا کہ ایک نقاد جلال الدین احمد نے پاکستان کوارٹرلی (انگریزی) میں ایک مضمون لکھا ہے جس میں میرا نام تمہارے اور ابن سعید کے ساتھ لیا۔ اشفاق احمد کی تصویر بھی چھاپی ہے۔ شوکت صدیقی۔ انور اور جلیس کا بالکل ذکر نہیں کیا۔ حیرت ہے

میرا حال تم نے دیکھ ہی لیا۔ میرا بارود قریب قریب ختم ہو گیا۔ اب کے ایک بہت گھٹیا قسم کی نظم مکمل تھی وہ مرزا صاحب نے ادب لطیف میں سب سے پہلے چھاپ کر میری رسوائی کا سامان مہیا کر دیا۔ جو نظمیں اچھی ہیں ـــ یعنی میری پسند کی ہیں ان میں سے کوئی پوری نہیں آتی مزاحیہ اور طنزیہ مضمون لکھنے میں میں پھسڈی رہ گیا۔ میری کتاب ـــ خارگندم یہاں سے چھپنے والی تھی لیکن میرے پاس مضمون ہی پورے نہیں۔ سوچتا ہوں تم لوگوں سے اور لاہور سے دوری تو اس کی وجہ نہیں۔؟ اگر میں نے آئندہ چھ مہینے میں کئی مضمون اور نظمیں لکھ دیں تو فبہا ورنہ میرا فاتحہ پڑھ لینا۔

✣ ✣ ✣

اچھا تم تو مصری شاہ میں رہتے ہو۔ تمہیں سب سے بڑا ADVANTAGE یہ ہے کہ تم نے دنیا دیکھی ہے۔ میں گورکی کی کتاب پڑھتے وقت تمہارا اور تمہاری کتاب پڑھتے وقت گورکی کا تصور کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آج کل کیسی گزرتی ہے۔ اب میں بہت اداس ہوں۔ تم مجھ سے دور ہو میں تنہا ہوں مجھے آہنی میخوں سے دفتر کے میز کے ساتھ ٹھونک دیا گیا ہے۔ میری گھریلو ذمہ داریوں اور پریشانیوں نے میرا امن و سکون چھین لیا ہے۔ میری عمر ۲۶ سال ہو چکی ہے۔ دس سال کے اندر اندر میں پوری طرح بوڑھا ہو جاؤں گا۔ میرے بال ابھی سے سفید ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ مجھے گورکی کی نانی پر حیرت ہوتی ہے جو ایسے ماحول میں رہتے ہوئے بھی جبکہ نانا صاحب نے انہیں الگ کر دیا تھا کہتی ہے ــ "میرے اللہ یہ دنیا کتنی جمیل ہے۔ میرا بس چلے تو میں قیامت تک یہیں رہوں" اور جو آٹھ دس آنے کما لیتی ہے تو اسے خیرات کے طور پہ غریبوں کی کھڑکیوں کے چھجوں پر رکھ آتی ہے۔ خفیہ خیرات کے طور پر۔

حمید اختر جیل سے رہا ہو گیا - آخر اسے جیل میں کیا تکلیف تھی؟ ایک صاحب لاہور سے آئے ہیں - ان کا بیان ہے کہ اس کے سر کے بال جھڑ گئے ہیں - یہ سب نظر بندی کا کھیل ہے - مجھے عبدالمتین عارف کا خیال آتا ہے - مجھے وہ شخص بہت پسند ہے - بہت مخلص دوست ہے لیکن معلوم نہیں اس کا نام سن کر مجھے بے اختیار ہنسی کیوں آ جاتی ہے - شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی شکل کے ساتھ کمیونزم کا جوڑ کچھ ٹھیک نہیں بیٹھتا - اب تو سنا ہے وہ کہیں پڑھ رہا ہے اس کے بعد کسی اسلامیہ ہائی اسکول میں ٹیچر ہو جائے گا اور لڑکوں کو چوپڑ کی سڑکوں کا رقبہ نکالنا سکھایا کرے گا لیکن اگر حوضوں اور نالیوں کا سوال سمجھاتے وقت اس نے جدلیاتی مادیت کے سوال سمجھانے شروع کر دیئے تو بڑی مشکل ہو جائے گی - ہماری آئندہ نسل بالکل ہی ان پڑھ رہ جائے گی - احمد راہی کو لو مجھے تعجب ہوتا ہے اس نے کڑھائیاں مانجنے - قالین کی پشم رنگنے اور شام کو اکھاڑے میں دو دو ہاتھ کرنے کے بجائے یہ دس بارہ جماعتیں کیسے پڑھ لیں اور پڑھ لیں تو آٹا پیسنے کی چکی کا منشی ہونے کی بجائے شاعر اور ادیب اور ایڈیٹر کیسے ہو گیا - دراصل انہی چھوٹی چھوٹی محیرالعقول باتوں ہی سے تو خدا کا وجود ثابت ہے - قاسمی صاحب کا نام آتے ہی غائبانہ آنکھیں جھکا لینے کو جی چاہتا ہے اور ملک کو دیکھتے ہی اسے چمٹ جانے، اس سے گالیاں سننے اور لاہور کے ادبی اور سیاسی حلقوں کے انتہائی اندرونی حالات دریافت کرنے کا جنون پاؤں کے تلووں سے گھس کھوپڑی کو چٹخا کر نکل جاتا ہے ع

اے پیارے لوگو تم دور کیوں ہو

میں نے لاہور چھوڑنے کے بعد جتنی نظمیں اور میر کے رنگ میں

جتنی غزلیں لکھی ہیں سب میں دوستوں سے جدائی اور ISOLATION کا بہت شدید احساس پایا جاتا ہے - ایک غزل کا مقطع تھا:

انشا اب انہی اجنبیوں میں چین سے باقی عمر کٹے
جن کی خاطر بستی چھوڑی نام نہ لو ان پیاروں کا

٭ ٭

اب تو تمناؤں کا باغ مرجھا رہا ہے اور حسرتوں کا دامن پھیل رہا ہے اب زندگی "فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے" تک محدود ہو گئی ہے - زیادہ نہ لکھنے کی وجہ بھی یہی ہے جب میں آسانی سے اچھے ادیبوں کی کتابیں خرید کر نہایت اطمینان سے پڑھ سکتا ہوں تو مجھے خود کچھ لکھنے کی کیا ضرورت ہے - ہاں تم کراچی آؤ تو کافی ہاؤس میں بیٹھیں - کلفٹن پر گھومیں - کیماڑی میں تیل آلود سمندر میں کشتی کی سیر کریں - طویل شام آس کاٹے پل پر گزاریں جس پر شکلا نے مضافات نظم لکھی تھی - اور ان چند دنوں میں میں اتنے قہقہے ماروں کہ باقی عمر کے لیے بے نیاز ہو جاؤں -

لیکن بچو تم خط تو لکھو گے! ارے یہ تو تیری گپ ہے!

ابن انشا

۳۰ اگست

پیارے!

اب میری درد بھری کہانی پوسٹ کارڈ کی زبانی سنو - لاہور سے آنے کے چند دن بعد ملیریا کا RELAPSE ہوا اور میں دس دن کے لیے بالکل فرش پر لیٹ گیا حتی کہ ٹائیفائڈ کی سٹیج آ گئی اور ڈاکٹر نے انجکشن دیا - مجھے ٹائیفائڈ سے ڈر آتا ہے اس لیے تندرست ہو گیا - تندرست یہاں لغوی معنوں میں استعمال نہیں ہوا - FIGURE OF SPEECH کے طور پر کہہ رہا ہوں کیونکہ اب بھی میں اتنا نحیف اور بیمار ہوں کہ دفتر میں بیٹھنا اور کام کرنا خارج از بحث ہے - آدھی فرلانگ بھی جانا ہو تو رکشا میں لد کر جاتا ہوں اور ڈاکٹر کہتا ہے کہ لازماً ایک ماہ اور آرام کرنا پڑے گا - یہ آرام آدھی تنخواہ پر ہوگا اور میں عزیب (افورڈ) نہیں کر سکتا - انجکشنوں اور ٹانکوں کا بظاہر کوئی اثر نہیں ہوا بس تمہارا خط آنے سے کچھ اطمینان ہوا ہے لیکن منہ پر رونق آنے کی حد تک نہیں - اب نہ کہیں جاتا ہوں نہ کسی سے ملتا ہوں - ایک ناول خط کا بھی اسی وجہ سے ہوا - ایک — پرسوں بھیج رہا ہوں لیکن EXERT کرنا پڑتا ہے اور اس کی ممانعت ہے - شاید مجھے یہ مکتوب نویسی SUSPEND کر دینا پڑے خصوصاً اس لیے کہ "نیکی کر دریا میں ڈال" والا معاملہ معلوم ہوتا ہے - اگر کل کلاں کسی نے کچھ بھیجا بھی تو میری توقع اور ضرورت سے اتنا کم ہوگا کہ مجھے صدمہ ہوگا - میں یہ کام بزنس لائک ہو کر کرنے کو تیار ہوں ورنہ نہیں - اس لیے کہ کالج میں پڑھتا ہوں اور صرف پڑھائی کا خرچ -/50 ماہانہ ہے - یہ بات .... کو بتا دینا - جو کچھ بھیجتا ہوں وہ بالکل گیسٹ کر بھیجتا ہوں لیکن یہاں کراچی میں خصوصاً یہ چیز بہت مقبول ہوئی - انکار والے (جنہیں معلوم نہیں کون لکھتا ہے) میرے پاس اس کی تعریف

کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ تم بھی ایسی چیزیں لکھو - وہ سمجھے کہ اسے حمید لاہور میں بیٹھا بیٹھا یہ سب کچھ لکھ رہا ہے (حالانکہ تم اتنا گھٹیا نہیں لکھتے)

جان من - تمہارے خط زندگی بخش ہوتے ہیں - ایک خط آج ہی لکھ دو بس -

تمہارا

بچہ کا

کراچی ۲۷ نومبر

پیارے حمید!

تمہارا چھوٹا سا پوسٹ کارڈ ملا تھا جس میں یہ وعدہ معشوقانہ (جو کبھی وفا نہ ہو) موجود تھا کہ تم مجھے جلد ہی دوسرا اور مفصل خط لکھو گے۔ وہ خط تم آج لکھتے ہو۔

دریں اثنا نگارش میں تمہارا تعزیوں والا مضمون دیکھا۔ تمہارے ہاتھ اور تمہارا منہ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ اگر دو چار سال یہی حالت رہی تو ہم جیسے لوگوں کو تمہاری شہرت کے قطب مینار کی طرف پگڑی سنبھال کر دیکھنا پڑے گا۔ چودھری نذیر کا ذکر تو سبحان اللہ — تم اسے اچھے "ٹکرے ہو"

اب بہت خوش مت ہو چکی تمہاری اب مطلب کی بات یہ ہے کہ جلد خط لکھو۔ ورنہ میں مر جاؤں گا۔

آج کل کیا حال ہے تمہارا۔ نظام سے کیا ملتا ہے اور پلازا کے ٹکٹوں کی بلیک مارکٹ سے سگریٹ کے دام نکل جاتے ہیں یا نہیں۔؟

یہ خط جو ملفوف ہے بصورت مضمون چھاپنا چاہو تو چھاپ لو اور گھٹیا تنقیدی مضامین مت چھاپو۔

تمہارا

بجڑ کا

عارف کے بچوں کو پچکارنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ مرزا ادیب کا ذکر ذرا DAMAGING ہو گیا ہے کہ نہیں؟

۱۹۵۳ء
۱۱ مارچ لاہور

جانِ من! روحِ روانِ من اے حمید!

تمہارا دو سطری مجہول کارڈ کبھی کبھی مل جاتا ہے اور کبھی کبھی بیرنگ لفافہ بھی لیکن اس سے میرا پیٹ نہیں بھرتا۔ جی تو چاہتا ہے کہ تمہیں دل کے شیشے میں بٹھا لوں۔ جس سے انتظار حسین وغیرہ کو شیشے میں پری اتارنے کا محاورہ کہنے اور دل کے آئینے میں ہے۔ تصویرِ یار کا گھٹیا شعر گنگنانے کا موقع مل سکے لیکن بس نہیں چلتا اور اس دنیائے لافانی میں کسی پر کسی کا بس نہیں چلتا۔

اب سنو ایک بات مطلب کی۔ برگِ گل کا پہلا پرچہ میرے بھائی نے تمہیں پہنچا دیا ہو گا۔ دوسرا پرچہ اچھا نکلے گا اور بازار میں بھی آ جائے گا۔ ممکن ہے میری ادارت میں یہ آخری پرچہ ہو کیونکہ اس کے بعد میں فارغ التحصیل ہو جاؤں گا، لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ تمہارا نام کسی نہ کسی طرح اس سے ASSOCIATE ہو جائے۔ برگِ گل کے لیے تمہارا کوئی مضمون مل گیا تو یوں سمجھ لوں گا جیسے تمہیں گلے لگا لیا ہو۔ جیسے کسی برکھا رُت شام میں لارنس کی طرف نکل گئے ہوں۔ جیسے تم میرے چینی کابک میں میرے بالکل پاس بیٹھے دنیا جہان کی حیرت انگیز باتیں کرتے ہوئے دنیا جہان کے پروگرام بنا رہے ہو — اور ہاں تمہاری ایسی تصویر بھی چاہیے جو اور کہیں نہ چھپی ہو۔ ہمارے کالج کی لڑکیوں کو تم بہت پسند ہو (مجھے اس لیے ان پر اور تم پر غصہ بھی آتا ہے) اس لیے اس فرمائش میں قارئین کرام کا پُرزور اصرار بھی شامل سمجھ لو۔ اور یہ بات دیکھ لو میں یہ نہیں چاہتا کہ تم ایسا مضمون بھیجو جو ایک بار ریڈیو پر چھتیس بار روزناموں میں چھپ چکا ہو۔ اگر SERIOUS یا جدید ٹائپ کہانی نہیں لکھ سکے تو LIGHT قسم کی چیز بھیجو۔ دیکھو ضرور بھیجو (حرامزادے تو نے داستان

غریب مرزا مجھے نہیں بھیجی۔ سالے ریویو کر دیتا اور تمہیں پطرس سے زیادہ (درجہ دیتا)۔ ورنہ میرا ارادہ ہے کہ تمہارے بعض خطوط کو شائع کر دوں ایک میں عینک لگی لڑکی کا منہ چڑھنے کا ذکر ہے جو ناک پر رومال رکھ کر یوں آتی ہے جیسے نتھنا نہ صاف کر رہی ہو۔ اور باقی خطوط میں تو اس سے زیادہ حرمزدگیاں ہیں۔

بس پیارے تھوڑا لکھے کو بہت جانو۔ ایک کہانی یا مضمون یا طویل خط (برائے اشاعت، ہم دونوں کی رفاقت کی یاد) مجھے بھیجدو۔ اپنی ایک یا دو تصویروں کے ساتھ۔ ایک میں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں تاکہ جب ذرا گردن جھکاؤں دیکھ لوں۔ اس لیے کہ تم پر پیار بہت آ رہا ہے۔

(ابن انشا)

۱۶؍جون ۱۹۵۳ء

حمید!

تم اپنے ڈیڑھ ماہ پہلے کے خط میں رقمطراز ہوئے تھے۔

"...... اگلے ہفتے تمہیں ایک بڑی خوب صورت شے روانہ کروں گا۔ بے فکر رہو......"

میں ابھی تک بے فکر ہوں۔ تم اپنی کہو۔ کیسے کہیں کے۔

ابن انشا

۵ ستمبر ۱۹۵۳ء

جمیل - تم عجیب آدمی ہو - پرلے درجے کے گدھے ہو - میری طبیعت بہت دنوں سے غیر حاضر اور ناساز ہے - ایسے عالم میں جو خط لکھوں گا ظاہر ہے ویسا نہیں ہوگا جو میں برقائمی ہوش و حواس لکھتا ہوں - میں نے سنا تھا چٹان میں شاہد صاحب نے تمہارے متعلق کوئی بہت اچھی رائے ظاہر کی ہے اس لیے میں نے لکھدیا اچھا لعنت بھیجو -

اب ساقی میں طاہرہ احمد کا مضمون دیکھ کے لطف آگیا - تمہارے متعلق اس کی رائے اچھی ہے - میں نے جمیل اور کنول کے ریویو میں بھی کچھ لکھا تھا - اب کے ساقی میں میرا جو کالم ہے وہ بھی پڑھا ؟

ابن انشا

۸، اگست ۱۹۵۷ء

ڈیئر جمیل !

تمھیں اتنے دن جواب نہ دینے کا گنہگار ہوں اور آج بھی مختصر لکھ رہا ہوں - اس کی وجہ بتانا عذر گناہ بدتر از گناہ ٹھہرے گا -

سب سے پہلے اپنی کتاب کی سنو - تم نے مجھے لکھا کہ چھ کاپیاں بھیج رہا ہوں - پانچ فلاں فلاں پرچوں کے لئے اور ایک تمھارے لیے - پانچ تو خیر نکل آئیں جن پرچوں کے نام لکھے تھے اور چھٹی جس پر تمھارے ابا جان کا نام لکھا ہونا چاہیئے تھا ظاہر ہے کہ نہیں نکلی وجہ یہ کہ رکھی ہی نہیں گئی تھی -

سو ایک کاپی تو میں نے رکھ لی - دوسری کا ریویو "الشجاع" میں کیا گیا - باقی رہیں تین - ان میں سے ایک رفیق خاور کو ریویو کے لیے پہنچا دی اور جب ان کے ہاں ریویو کی گنجائش نکلے گی اس پر بھی ریویو آئے گا - شاید اگلے ماہ آئے - ایک ممتاز حسین کو سیارہ کے لیے دی گئی اور معلوم نہیں اس وجہ سے یا کسی اور بنا پر - وہ سیارہ سے الگ ہو گئے - اب کتاب اُن کے پاس ہے لیکن سیارہ ان کے پاس نہیں ہے ایک کاپی امروز میں دی گئی - جس کی رسید تک نہیں ملی

نظم تم نے پسند کی - سالے تم بھی مذاق کرو گے ؟

رفیق خاور کو ۳۰ تاریخ کا سمن مل گیا ہے - اس کے دفتر والوں نے اسے SCAPE GOAT بنایا ہے اور کہا ہے کہ تم پرائیویٹ طور پر اپنے خرچ پر صفائی کا انتظام کرو - بری ہو گئے تو مناسب خرچ مل جائے گا - نہ ہوئے تو معلوم نہیں کیا ہوگا - بہر حال یہ ان کے دفتر کا راز ہے ضروری نہیں تم اسے پھیلاتے پھرو - میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمھارے ساتھ

معاملہ کہاں تک ہے۔ آتے ہوئے سالک صاحب اور دوسرے معززین سے صفائی کی تحریر لیتے آنا۔ مولوی عبدالحق سے میں لے لوں گا۔ شاہد صاحب وغیرہ سے بھی۔

تمھارا

ابن انشا

تخلیق کراچی

٣ر جون ١٩٥٦ء

پیارے!

اس دن کے بعد تم سے ملاقات نہ ہوئی۔ اس میں میری مصروفیات اور موسم کا بہت قصور ہے۔ لیکن تمھاری ہماری محبت کوئی ملاقاتوں کی محتاج تھوڑا ہی ہے۔ تخلیق کے ایڈیٹر خواجہ صاحب میرے دوست ہیں تم تو ان سے ملے بھی تھے۔ پرچہ اچھا نکالیں گے۔ فوراً ان کو کہانی دو۔ VPP بھیجو۔ تم نے کہانی نہ دی تو میں تمھارے پیسے جو مجھے اپنے پرچے کی طرف سے تمھیں دینے ہیں، دبا جاؤں گا۔

حفیظ کو سلام۔ اس کی صحت اچھی ہے بچ جاؤ تم سے دوبارہ نہ ملنے اور حفیظ کی دعوت نہ کھانے کا دلی ملال ہے۔

مقصود کا پتہ مجھے بھیجو۔ وہ کتابوں کے ڈیزائن بنانے کا کیا لیتا ہے۔ مجھے اس کو چینی نظموں کے بارے میں خط لکھنا ہے۔

تمھارا

ابن انشا

۱۰، اگست ۱۹۵۶ء

پیارے حمید!

تم نے ایک روز ڈھائی سطر کا رسمی خط لکھا تھا اُس کے بعد چپ ہو گئے۔ میں اس قسم کے نخرے برداشت نہیں کیا کرتا۔ سیدھے منہ بات کیا کرو۔

نظام چل رہا ہے۔ واقعی اب اچھا ہو رہا ہے۔ تمہارے کام بہت اچھے ہیں۔ مثلاً وہ "بج رہا ہے اور بے آواز ہے" کی یہاں بہت تعریف ہوئی ہے۔ باقی مضامین میں بھی لطافت و مزاح کا رنگ آ رہا ہے جو پرچے کی کامیابی کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ لو بس اب سمجھ لو کہ میرا مضمون آیا کہ آیا۔

اب ادبِ لطیف کا طویل مختصر افسانہ نمبر ملا ہے۔ تمہاری کہانی ابھی پڑھی نہیں۔ سہولت کو لیٹ کر مزے لے لے کر پڑھوں گا اور پھر اس کے متعلق بات کروں گا۔ اس وقت تو میری جان تمنا یہ ہے کہ تم خط لکھو جس میں گالیاں دو۔ اگرچہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو، میں گالیاں کھانے کا نہیں بلکہ پیار کیے جانے کا مستحق ہوں۔ بس صبح ہی سے تمہارے۔ روایتی انداز کے محبوب خط کا انتظار شروع ہے۔

ابن انشا

کراچی

۶، ستمبر

پیارے حمید

تمہارا پیارا خط ملا۔ اس کے بعد میرا منحوس خط بھی ملا ہوگا تمہیں۔ ابھی افسردگی طبیعت میں بہت ہے۔ معذرت نہیں کرتا۔ دو چار ہی روز میں تمہارے خط کے شایانِ شان جواب دوں گا۔ تم نے اُس لڑکی کا ذکر کر کے تو۔ اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے اچھائیاں اپنی اپنی قسمت ہے۔ یہاں بہت سے لوگوں کو شک ہے کہ میرا تم سے کسی قسم کا ایسا ویسا تعلق ہے۔ کاش ہوتا۔ یعنی یہاں اتنی سی حسرت ہے اور تم ہو کہ بیٹھے بیٹھے میری چھاتی پہ مونگ کیا سب کی سب دالیں بیک وقت دل رہے ہو۔ کاش تم ایک بار کراچی آجاؤ۔ یہاں کئی لوگ تمہیں دیکھنے کے مشتاق ہیں۔ لطیفہ یہ ہے کہ تمہیں دیکھ کر ان کی غلط فہمی دور نہیں ہوگی اور تقویت پکڑ جائے گی۔ (دیکھا FLATTER کرنے کا نیا طریقہ!)

انور جلال صاحب کا خط ملا جس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے احساس کو چھوڑ دیا۔ اب کے احساس میں لذتِ سنگ اور روسیاہ دونوں کالموں میں روئے سخن انہی کی طرف معلوم ہوتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی خاصی بدمزگی ہوئی ہے۔ میں اپنی مشکل تم سے اپنے پہلے خط میں بالتفصیل بیان کر چکا ہوں۔ میں نے اس ADVENTURE میں تمہاری وجہ سے ہاتھ ڈالا تھا۔ (میں احسان دھرنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ تم پر احسان کرنے کا ٹھیک طریقہ تو یہ ہے کہ تمہارے پرچے کے لیے مفت ایک خط ہر ہفتے لکھوں)۔ بہر حال میں ہوا میں لٹکے رہنا پسند نہیں کرتا

اور نہ لاہور کے تمام ہفت روزوں میں باری باری لکھنے کا خواہشمند ہوں۔
میں نے (صحیح یا غلط طور پر) احساس کے ایڈیٹر عباس احمد عباسی صاحب
کو جن سے میرا اچھا خاصا تعارف ہے۔ ایک خط لکھا ہے جس میں یہ
خوشخبری دی ہے کہ میں عدم ادائیگی معاوضہ کی وجہ سے یہ سلسلہ بند کر
رہا ہوں۔ انور جلال تمہارے دوست ہیں لیکن تم میرے عزیز از جان
دوست ہو۔ مجھے روح کی گہرائی تک جانتے ہو اور مردِ معقول ہو —
اس لیے غالباً میرے طرزِ عمل کو قابلِ اعتراض نہ سمجھو گے۔ البتہ اگر تمہارے
نزدیک میرا اقدام غلط ہے تو میں سو فیصدی تمہارے مشورے پر عمل
کرنے کو تیار ہوں۔ انور جلال صاحب سے براہِ راست میری اتنی رسم و
راہ نہیں نہ میں ان کے مزاج کا واقف ہوں۔ تم میرے اور اس کے
دوست ہونے کی بنا پر مجھے ٹھیک مشورہ دے سکتے ہو۔ یہ مشورہ مجھ
تک رہے گا اور تمہاری پوزیشن کس طرف سے AWKWARD ہونے
کا قطعاً سوال پیدا نہیں ہوتا۔ تم یہ بتاؤ کہ اگر احساس والے باقاعدہ
پیسے دے کر مجھ سے کالم لکھوانے چاہیں تو مجھے یہ سلسلہ جاری رکھنا
چاہیے یا وہاں سے بند کر کے انور جلال صاحب کو (معلوم نہیں اب
وہ کس پرچے کے لیے مکتوب مانگتے ہیں) اپنا کراچی کا مکتوب بھیجنا
چاہیے۔ اتنا ضرور ہے کہ یہ کام عباس احمد عباسی صاحب یا انور جلال
صاحب بلا معاوضہ مجھ سے لینے کی توقع نہیں کر سکتے۔ تم کر سکتے ہو۔

٭ ٭

اور کیا حال ہے جانی — اوپر جو لکھا ہے وقتی بے معنی ہے اُسے
عرق سے ناب کرو اور یا شیخ کوئی محبت بھری بات کرو۔ گزشتہ بار
بجرے کی سیر کیسی رہی۔ تمہاری شہزادی پری بانو کا کیا حال ہے اور
پاک ٹی ہاؤس تمہارا ایڈریس کب تک رہے گا اور تم ادھر کب آؤ گے

سردیاں بیشک آ رہی ہیں۔ اور تمہارا منہ چوم لینے کو جی بیشک
چاہتا ہے لیکن تم تو غسل خانے کی طرف نہیں بھاگو گے۔ میرا
لاہور آنے کو جی چاہتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ تم سے اب تک
"ملاقات" ہی نہیں ہوئی۔ صرف "تعارف" ہوا تھا۔

تمہارا

چڑکا

کراچی - ۲۵ اکتوبر

ننھکا! میری جان - تمھارا خط پا کر بے حد خوشی ہوئی۔ تمھارا احسان اخبار میں ہونا اور پھر اتنی دیر رہنا میرے لیے سوہانِ روح تھا لیکن چونکہ میں تمہیں کسی متبادل ملازمت کا پتہ نہیں بتا سکتا تھا۔ اس لیے چپ رہتا تھا - احمد بشیر کی بات اور ہے - وہ تو کامیاب زندگی کے لیے ہر طرح کا کیریر آزمانے کو تیار ہے گو یہ بات اسے بہت مہنگی پڑے گی - وہ نہ کامیاب بن سکے گا نہ خوش رہ سکے گا۔ احسان کی آب و ہوا ہی اتنی مسموم ہے کہ وہاں ترقی پسند تو درکنار کسی لبرل اور معتدل مزاج انسان کا گزر مشکل ہے - خیر اچھا ہوا۔ لیکن نکلے ہو یا نکالے گئے ہو۔ اگر نکالے گئے ہو تو کس پاداش میں۔ اب کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ سب چیزیں تفصیل سے لکھو۔

پچھلے کئی دن سے تم پر پیار آ رہا تھا اور تمھارا خط نہ بھی آتا تب بھی میں آج تمہیں خط ضرور لکھتا - دراصل بات یہ ہے کہ تم مجھے سمجھتے ہو اور میں تمہیں سمجھتا ہوں - میں تم سے کئی چیزیں لے سکتا ہوں اور تم مجھ سے کئی چیزیں سیکھ سکتے ہو - لیکن اب تو حالات ہی ایسے ہیں کہ یکجائی مشکل ہی نظر آتی ہے - اوّل تو یہاں مکان ہی میسّر نہیں - شہر سے کوئی چار میل باہر ایک بیابان میں ایک دوست کا مہمان ہوں - شاید تم اس دوست کو جانتے ہوں - ان کا نام لوک پال سیٹھی ہے اور وہ ملٹری اکاؤنٹس میں ملازم ہیں - ملٹری اکاؤنٹس کے غیر شادی شدہ مہاجر ملازمین کے لیے ان کے محکمے نے ایک ہسپتال کی بیرک دے رکھی ہے - جس میں باقاعدہ BED ہیں - شمال کی طرف ہمارے بالکل سامنے ملٹری ہسپتال کی عمارت ہے - اور ادھر مغرب میں جہاں سے ہو کر بس گزرتی ہے - SISTERS MESS ہے - اس

لفظ ہی سے تمھارے دل میں رومانیت جاگ اٹھی ہوگی، لیکن میری جان اس میں نرسیں بہت کم نظر آتی ہیں - جو دو چار گزرتی ہیں ان میں سے کوئی بھی ڈھب کی نہیں ہے - سب کی سب حسن عسکری کے افسانوں کے کردار ہیں، اور پھر تم جانتے ہو - اپنا یہ راستہ ہی نہیں ہے - باقی یہ جگہ چونکہ شہر سے دور ہے اس لیے تم اسے پُرفضا کہہ سکتے ہو لیکن پُرفضا ہونے کے لیے سبزے اور روئیدگی کا ہونا ضروری ہے اور یہاں سبزے کی جگہ خاک اڑتی ہے - محاورے کی خاک نہیں سچ مچ کی - بس نتیجہ یہ ہے کہ صبح آٹھ بجے اٹھتا ہوں وہ اس لیے کہ نو بجے پانی بند ہو جاتا ہے - نہانا ضروری ہوتا ہے - ورنہ بارہ بجے بھی نہ اٹھوں تو کوئی اٹھانے کا نہیں - خیر اس کے بعد ہسپتال کی کینٹین پر ناشتہ کر کے پھر بیرک میں آ جاتا ہوں - اتنے میں میرے دوست دفتر چلے جاتے ہیں اور میں پھر پڑھنے لگتا ہوں - پڑھتے پڑھتے سو جاتا ہوں اور کوئی ایک بجے اٹھ کر شیو کرتا ہوں - شیو کر کے پھر کینٹین پر چلا جاتا ہوں - کینٹین پر روٹی تو ملتی نہیں لیکن روٹی ہی واحد چیز نہیں جس میں غذائیت ہوتی ہے - ڈبل روٹی ہے - مکھن ہے - انڈے ہیں - جام وغیرہ ہیں خود لا رکھتا ہوں - دودھ بھی مل جاتا ہے - غرض یہ کہ دوپہر کا کھانا کھا کر آتا ہوں تو کوئی تین بجے کا وقت ہوتا ہے - بس سٹینڈ پر کوئی دس پندرہ منٹ انتظار کرنے پر بس مل جاتی ہے جو مجھے صدر پہنچا دیتی ہے -

صدر کراچی کے بارونق ترین حصوں میں سے ہے (شاید تم کراچی آ چکے ہو) - یہاں اُتر کر کیفے جارج میں چلا جاتا ہوں اور ڈیوٹی کے وقت تک (رام ملک) وہاں بیٹھا رہتا ہوں - چائے

یالین یا اور کچھ۔ بہرحال اچھا ہوٹل ہے۔ ہوٹل سے دفتر کوئی پانچ دس منٹ کا راستہ ہے چنانچہ وہاں پہنچ کر ایک ڈیڑھ گھنٹہ کام کرتا ہوں اور پہلی ڈیوٹی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر بازار کی سیر کرتا ہوں، پھر دہلی مسلم ہوٹل پر کھانا کھاتا ہوں پھر پارس ہوٹل میں چائے پیتا ہوں اور ۲½ بجے دوسری ڈیوٹی پر چلے جاتا ہوں۔

دوسری ڈیوٹی نو بجے ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد کوئی حاضری جلدی نہیں ہوتی۔ ٹھنڈے ٹھنڈے دفتر کے دوستوں سے باتیں کرتا پھر صدر جاتا ہوں۔ وہاں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ چائے نوشی اور گپ بازی میں گزرتا ہے۔ سینما اچھا ہو تو چونکہ پاس ہی ہوتا ہے وہاں چلا جاتا ہوں (کافی سینما دیکھتا ہوں) ورنہ کوئی گیارہ بجے کے قریب وکٹوریا روڈ پر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں گھر کی راہ لیتا ہوں۔ یہاں سے گھر کوئی تین چار میل ہے اور راستہ کافی ویران سا ہے۔ بس دونوں طرف لمبے لمبے احاطوں والی اور سفیدے کے درختوں والی کوٹھیاں ہیں۔ کوئی فلیٹ یا "مکان" نہیں۔ کوئی دکان نہیں اور اس وقت تو یعنی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب بس کوئی گزرتا آدمی یا کوئی رکشا ہوتا ہے جو تھکا ہارا دھیمی رفتار سے مشرق سے مغرب کو یا مغرب سے مشرق کو نکل جاتا ہے۔ میری منزل کے عین درمیان میں فریئر ہال ہے۔ یہ جگہ مجھے کراچی بھر میں سب سے زیادہ پسند ہے۔ کھلا ماحول ہے۔ آدمی کم ہوتے ہیں۔ بچے کچھے ہوتے ہیں۔ اور سامنے فریئر ہال کی انیسویں صدی کی عمارت ہے۔ گرجا نما اور تم جانتے ہو مجھے اور تمہیں اسی کلچر اسی تہذیب اور اسی پُراسرار قدامت سے محبت ہے۔ چنانچہ یہاں میں

جی بھر کر بیٹھتا ہوں۔ ایک گھنٹہ۔ دو گھنٹے۔ کبھی بارہ بج جاتے ہیں کبھی ایک اور کبھی دو بھی۔ پھر سب لوگ چلے جاتے ہیں اور میں بھی ہولے ہولے گھر کی راہ لیتا ہوں۔

فریئر ہال سے گھر کوئی ڈیڑھ میل رہ جاتا ہے۔ راستے میں صرف ریلوے لائن اور کراچی چھاؤنی کا اسٹیشن آتا ہے۔ اس کے آس پاس بھی ہوٹل ہیں جو دن رات کھلے رہتے ہیں۔ اس وقت وہاں سے بھی بھیڑ چھٹ چکی ہوتی ہے سو وہاں ایک پیالی چائے پیتا ہوں اور ریلوے کے پھاٹک پر پہنچ جاتا ہوں۔ پھاٹک بند ہو یا کھلا۔ وہاں بیٹھنا ضروری ہے اور جب تک ایک دو انجن ایک دو گاڑیاں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آ جا نہ لیں طبیعت نہیں بھرتی۔ یہ کافی رومان انگیز اور روح پرور ماحول ہوتا ہے۔ ٹریفک عموماً ختم ہو چکا ہوتا ہے اور پھاٹک کا چوکیدار بھی میرے لائن کے بالکل قریب بیٹھنے پر معترض نہیں ہوتا۔ مجھے انجنوں سے محبت ہے۔ خصوصاً کوئلے والے دیو ہیکل بھاری بھرکم انجنوں سے۔ اب یہ انجن تیل کے انجنوں میں تبدیل کیے جا رہے ہیں ان کا سائز بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ ان سے نہ دھواں نکلتا ہے نہ شرارے جھڑتے ہیں نہ رات کو دور سے انجن کی بھٹی میں لاٹیں مارتی ہوئی آگ دکھائی دیتی ہے۔ غرضیکہ نہایت UNIMPRESSIVE چیزیں ہیں یہ انجن۔ خیر مطلب یہ کہ کوئلے کے انجن اب بہت تھوڑے دنوں کے مہمان ہیں۔ اور ان کا CHARM جاتا رہے گا۔

ریلوے لائن سے کوئی ایک میل پر گھر ہے۔ اس ایک میل کو میں جلدی جلدی طے کر کے اپنی بیرک میں پہنچتا ہوں۔ وہاں میرے بستر کے قریب کا بلب رات بھر جلتا رہتا ہے۔ لوگ سو چکے ہوتے ہیں

میں خاموشی سے کپڑے اتار کر بستر میں لیٹ جاتا ہوں۔ سونے سے پہلے کتاب ضرور پڑھتا ہوں۔

⁂ ⁂ ⁂

سو یہ ہے روزمرہ کی زندگی۔ ہفتے کو چھٹی ہوتی ہے ہفتے کی شام کافی ہاؤس میں گزارتا ہوں۔ اتوار کی صبح منوڑہ جاتا ہوں کشتیوں کی سیر اچھی رہتی ہے، دراصل کراچی خاص سے منوڑہ جانے کیلئے کشتیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لانچ بھی مل جاتی ہے یعنی انجن والی کشتی، لیکن مجھے بادبانی کشتی پسند ہے۔ دیر سے تو پہنچاتی ہے لیکن وہ کشتی کیا جس میں بادبان نہیں۔ ملاح نہیں۔ ڈوبنے کا خطرہ نہیں......

سو میرے بھائی یہ ہے آج کل کی زندگی اور مجھے اس زندگی سے کوئی شکوہ نہیں۔ ویرانے کا اُلّو واقع ہوا ہوں۔ آبادی سے یوں بھی گھبراتا ہوں۔ میرے لیے تو یہی کراچی ہے۔ میرے خیال میں یہ سب چیزیں تمہیں دلکش اور جاذب نظر آئیں گی۔ اگر ایسا ہے تو مجھے کوئی تعجب نہ ہوگا۔

⁂ ⁂ ⁂

اوپر کی سطور کل دفتر میں تمہارا خط ملنے پر لکھی تھیں، جلدی سے چند سطور اپنی بیرک سے لکھ رہا ہوں۔ موڈ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ چنانچہ باتیں بھی اسی طرح کی کروں گا۔ سردیاں شروع ہو چکی ہیں اور رات کو کافی سردی رہتی ہے۔ یہاں کوئٹے سے سردی کی لہر آیا کرتی ہے اور تم اخبار پڑھتے ہو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ کوئٹے میں آج کل درجہ حرارت ۱۹ ڈگری تک پہنچ جاتا ہے۔ یعنی درجہ انجماد سے بھی ۱۳ درجے نیچے۔ خیر ہرچہ آید بر سر اولادِ

آدم بگذرد۔ مالی پریشانیوں سے یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ ڈھائی سو میں سے ایک سو اپنے پاس رکھ کر ڈیڑھ سو گھر بھیجتا ہوں اور یہاں مضامین سے اوسطاً پچاس ساٹھ روپے اور کمانے پڑتے ہیں۔ تب کہیں گزارہ ہوتا ہے۔ پھر کوئی نہ کوئی خرچ سامنے رہتا ہے۔ پتلون کی سلائی۔ بوٹ۔ گرم کوٹ (کپڑا۔ سلائی) کمبل چارپائی۔ سائیکل۔ نئی عینک وغیرہ وغیرہ۔ یہاں آکر سوٹ بنوایا۔ ایک سویٹر خریدا۔ کچھ قمیضیں پاجامے بنوائے۔ غرضیکہ کافی خرچ ہوگیا۔ اور تو اور کتابوں کا خرچ کافی ہے (مثلاً اس ایک مہینے میں اٹھارہ روپے) نتیجۃً پاؤں ہر وقت چادر سے نکلے رہتے ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

اور باقی اب تم کہو کیا حال ہے۔ انجمن کا کیا حال ہے۔ تمہاری تحریروں تمہارے افسانوں اور تمہارے ناولوں کا کیا حال ہے۔ امجد اہی کا کیا حال ہے۔ ملک کا کیا حال ہے۔ مظفر کا کیا حال ہے انجمن کی کانفرنس میں باہر سے کون کون لوگ آرہے ہیں۔ کانفرنس ہو کہاں رہی ہے۔ احسان میں جو مہم چل رہی ہے اُس کا تو کچھ کچھ پتہ چلتا رہتا ہے۔ باقی ترقی پسندوں کے متعلق ڈاکٹر تاثیر اور عبدالسلام خورشید کے مستقل کالم بھی پڑھتا رہتا ہوں۔ نظام میں (غالباً) عبداللہ ملک کی طرف سے تاثیر کا دندان شکن جواب بھی پڑھا ہے

⁂ ⁂ ⁂

میں نے یہاں آکر چند متفرق مضامین لکھے ہیں بعد میں وہ سب امروز میں چھپے، کیونکہ آخر رشتہ روح وتن تو برقرار رکھنا ہے۔ ان میں بعض اتنے اچھے ہیں کہ میں امروز کی بجائے سویرا میں چھپوانے ۔ میرے نزدیک پیسہ سب سے بڑی ضرورت

نہیں رہا ہے۔ اور سویرا نے مجھ سے جو سلوک کیا ہے وہ کافی شرمناک ہے۔ مضمون کے لیے مجھ سے -/۲۵ روپے کا وعدہ کیا گیا اور مجھ پر زور دے کر مضمون اس طرح لکھوایا گیا کہ لاہور سے کراچی آنے کی آخری درمیانی شب بیٹھا امروز کے دفتر میں لکھتا رہا۔ تب کہیں اسٹیشن پر گیا۔ چودھری صاحب اور راہی صاحب ملے تو مضمون ان کے حوالے کرنے کے قابل ہوا۔ اس وقت چودھری صاحب کو یاد آیا کہ وہ روپے اپنے ساتھ نہیں لائے لیکن اس میں کوئی ہرج نہیں۔ چنانچہ انہوں نے یہاں کے ایک کتب فروش کے نام چٹ لکھ دی کہ ابن انشا صاحب میرے عزیز دوست ہیں انہیں بیس روپے میرے حساب میں سے دے دیجیے۔ میں نے -/۲۵ کی بجائے -/۲۰ کر دینے پر احتجاج کیا تو انہوں نے کہا صرف اب کے یہ لے جاؤ حالات۔ فسادات......

خیر یہاں آکر کتب فروش کے ہاں گیا۔ اس نے کہا کہ نذیر صاحب ہم سے سب کچھ وصول کر چکے ہیں۔ ان کا اب ہمارے ساتھ کوئی حساب نہیں۔ چنانچہ میں خود بھی شرمسار ہوا اور ان کو بھی شرمسار کیا۔

اس پر ایک لفافہ راہی صاحب کو لکھا — جواب ندارد
یاد دہانی کے لیے ایک کارڈ لکھا —— جواب ندارد
شرم دلانے کے لیے ایک خط لکھا —— جواب بالکل ندارد

گلہ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

۲۰ اکتوبر کا لکھا خط آج ۹ نومبر کو پوسٹ کر رہا ہوں۔

تمہارا

بچہ کا

۲۳ جون ۱۹۷۱ء

ارے گنگے میری جان

تمہارے یادوں کے گلاب سب کے سب میں نے پڑھے ہیں بلکہ سونگھے ہیں اور پرانے دنوں کی یاد پر دل کو کچھ کچھ ہوتا بھی رہا ہے بعض جگہ تم سے البتہ بھول ہوئی ہے کیونکہ دردوغ گورا حافظہ نباشد۔ بعض جگہ تمہیں ٹوکنے کو جی چاہا لیکن فطری کاہلی کی وجہ سے نہ ٹوک سکا۔ عزیز من یہ خوشبو کے پان والا کیا قصہ ہے۔ ارے میں تو خوشبو کا پان کھانے والے کے پاس سے بھی نہیں گزر سکتا۔ اس گپ میں کیا سائنس ہے۔ کچھ تو عقل سے کام لیا کرو۔

وہ انگریزی کا ہفتہ وار پرچہ جس کی تم سرپرستی کرتے تھے بند ہو گیا یا ابھی تک نکل رہا ہے۔ اس کا ذکر میں نے تمہارے ہاں نہیں دیکھا۔ عشق و عاشقی لڑکیوں کے تذکرے میں بھی تم ڈنڈی بلکہ ڈنڈا مار جاتے ہو۔ لڑکیاں تمہاری موہو ٹھگنی شکل اور موہو ٹھگنی تحریر کے چکر میں آجاتی ہیں اور تم اپنا گُل کر لاتعلق ہو جاتے ہو۔

خیر میاں ہم تو تمہارے عاشق ہیں۔ فی زمانہ اور کوئی ہمیں اپنے پر عاشق ہونے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ اب کے سنڈے میں جو تصویر تم نے چھاپی ہے جس میں میں تم اشفاق اور منیر نیازی کھڑے ہیں یہ مجھے چاہیے۔ بھیج دو۔ کاپی کروا کے واپس کر دوں گا۔ ارے میں تمہاری طرح جھوٹا اور ناقابل اعتبار آدمی نہیں ہوں۔ ضرور واپس کر دوں گا۔ میری کتابیں جو تم پی گئے ہو وہ میں نے معاف کیں بلکہ بھول گیا مجھو۔ میرا بھی تو حافظہ خراب ہے۔

اب کے لاہور آیا تو ملوں گا اور جی کڑا کر کے تمہارا منہ چوم لوں گا اور شہر میں گھومیں گے۔ لاہور کی گلیوں میں جنگ تم

نہیں پڑھتے۔ اس میں ہمارے قلم سے جو ادب عالیہ سرزد ہوتا ہے اس سے محروم رہتے ہو۔ تمھاری قسمت۔ اچھا اب میری دو کتابیں آرہی ہیں۔ ایک جدید اردو ریڈر۔ اردو کی آخری کتاب کے نام سے۔ دوسری سفرنامہ، "آوارہ گرد کی ڈائری" ان کے بارے میں کچھ لکھنے کو تیار رہو۔ حرام خوری مت کرنا۔

خط لکھو۔ فوراً

تمھارا

انشؔا

۵ ر جون

اے (پیارے) حمید

میں نے تمھارے کارڈ کے بعد دو تین دن مضمون کا انتظار کیا جب وہ نہ آیا تو میں سمجھا کہ تم حسب عادت حرامی پن کر رہے ہو، چنانچہ کل جل کر ایک پوسٹ کارڈ لکھا جو تمہاری طبیعت کو خوش اور تمھارے مشام جان کو معطر کر چکا ہوگا۔ آج تمہارا رجسٹری لفافہ ملا۔ مضمون بھی پڑھا اور وہ دھجی بھی جو اصغر پیارے کے قلم سے لکھی ہے۔ میرے لیے اس دھجی کی قدر و قیمت زیادہ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مضمون اس سے گھٹیا ہے۔ تمھارے اس خط میں لے حمید کی شخصیت مقابلتہً زیادہ ہے۔

مضمون میں نے پڑھ لیا اور اس کے لیے تمھارا بہت ممنون ہوں لیکن میں نے دیکھا ہے کہ اس پر کاتب صاحب نے اپنے مخصوص نشانات بنا رکھے ہیں۔ کم از کم ایک بار ضرور کاتب اسے لکھ چکا ہے۔ کس کے لیے؟ دوسری بات یہ کہ اس پرچے میں جو ہے ہی کالج کے لڑکوں لڑکیوں کے لیے تمھارا اس قسم کا مضمون چھپنا تمہارے حق میں زیادہ اچھا نہ ہوگا۔ لوگوں کو آزاد صاحب سے زیادہ تم سے دلچسپی ہے۔ تمہیں اپنا کوئی افسانہ دینا چاہیے تھا یا مزاحیہ مضمون چاہیے وہ نسبتہً چھوٹا ہی ہوتا۔ اب بہرحال یہ مضمون تو میں نے تابو میں کر ہی لیا ہے۔ تم نے اسے مختصر کرنے کی ہدایت بھی کر دی ہے میں یوں بھی کسی کے مضمون کو قلم نہیں لگایا کرتا۔ اب بھی وقت ہے کہ افسانہ یا مضمون دے دو۔ یہ باتیں دوستی میں کہہ دیں اگر کسی پرچے کا کوئی ایڈیٹر ہوتا ہرگز نہ کہتا ورنہ آئندہ مضمون ملنے کی امید منقطع ہو جاتی۔ میری ایڈیٹری بھی تو اس شمارے کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔ تمہارے امتحان کا کیا ہوا۔ میرا بھی نتیجہ جولائی کے آخر میں آئے گا۔ آج کل میں کچھ نثر لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ایک مکالمہ سا ساقی کے افسانہ نمبر میں دیکھو گے۔ ایک اور مکالمہ سویرا کے اب تک نہ نکلنے کے متعلق ہے اس میں تمہارا بھی ذکر ہے اپنی اس زندگی کا بھی جب ہم کتابت کیا کرتے تھے اور نذیر تمہیں لسی پلاتا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہیں چھپواؤں۔ دیکھو۔ ورنہ تمہیں ویسے بھیجوں گا۔

جانِ من ذرا تفصیل سے لکھو۔ کیا کر رہے ہو اور کیا نہیں کر رہے ہو۔ کراچی کب آ رہے ہو۔ اور دیکھنا انتظار کا ایڈریس میں بھول گیا۔ اس نے مجھے کچھ بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ یاد دلا دینا۔ مجھے سب سے زیادہ انتظار تمہارے خط کا رہتا ہے۔ گاہے گاہے اپنے دل کا غبار نکال لیا کرو۔ ساتھ ہی میرا بھی نکل جایا کرے گا۔

ابن انشاء

"سویرا" لاہور یکم فروری لاہور

مائی ڈیر اے حمید!

تم مری کی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر ایسے چڑھ کے بیٹھ گئے ہو کہ ہم خاک نشینوں کی خبر ہی نہیں لیتے۔ بس بہت سیر ہو چکی۔ اب آ جاؤ۔

قرارِ خاطرِ بے تاب تھک گیا ہوں میں

ہاں ٹھیک ہے۔ تمہارا خط ملا۔ لیکن خط سے کیا ہوتا ہے۔ تمہیں اب تک بنفس نفیس پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ مثلاً آج میری نظم ہے بغداد والی۔ مجھے پڑھنے کا وعدہ تم نے کیا تھا۔ اور کل انجمن ترقی پسند مصنفین یوم چین منا رہی ہے۔ کیا یہ دن بہار کے تمہارے بغیر ہی گزریں گے۔

اور پھر افسانہ۔ اب تو سویرا بیچ آخری مراحل میں ہے چھپائی لکھائی کے۔ افسانے کے لیے طوالت کے لحاظ سے جگہ بھی تو موزوں۔۔۔ لیکن نمبر۔ صاحب کہتے ہیں تمہارا خط آ گیا ہے اور تم نے افسانہ پوسٹ

کر دیا ہے اور تم بنفس نفیس آ رہے ہو۔ بس بہتر معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی اس سارے کھڑاگ پر خاک ڈالوں اور کہوں۔ لو ایک قصہ سنو۔

لیکن قصہ سنانے سے پہلے مجھے یہ خط ضرور پوسٹ کرنے دو۔

ابن انشا

۵ مئی

جانِ من!

تمہارا مختصر سا ڈھائی سطری خط مل گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہارے امتحان ابھی اور بھی باقی ہیں۔ سخت بور آدمی ہو پیارے تم سکالر جیسی ہو۔ "عبدالحمید ادیب فاضل" بننے کی کوشش نہ کرو۔ ڈگری لے کر میں نے یا کسی اور نے کیا فیض پایا جو تم پاؤ گے۔ تمہارا ہتھیار تمہارا قلم ہے۔ خیر اب یہ امتحان دے ہی چکو۔۔۔ سنا ہے آفاق بند ہونے کی وجہ سے تمہیں مالی پریشانیاں بھی رہیں۔ اب یہ معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہے۔ مارشل لاء نے لاہور کی۔ یعنی لاہور کے کوچہ گرد آوارگی پیشہ گندگی پسند۔ تعلق نواز۔ چھوٹے خور۔ عاشق مزاج آزادہ روں کی زندگی کو جو تباہ کیا ہے اس پر کچھ لکھو۔ پیارے وہ لاہور لاہور ہی تھا۔ لاہور صاف سڑکوں اور رستے دودھ دہی کا نام نہیں۔ پر پیچ گندی گلیوں اور اونگھتے ہوئے افیمیوں کا نام ہے۔ اس کے متعلق کچھ لکھو۔ انتظار کا خط آیا تھا اسے اس شہر کی تباہی کا بڑا غم ہے۔ تم تو لاہور کو اس سے زیادہ جانتے ہو۔ تمہارا تو اس پر ناول بھی لکھنا ہے۔

میرا پرچہ محض تمہاری وجہ سے رکا ہوا ہے۔ اب بہت وقت نہیں۔ ایک ہفتے میں چیز بھیج دو۔ ہماری عاشقی اور اپنی معشوقی کی شرم ہی کرو پیارے گنکا۔

تمہارا

ابن انشاء

۹ر جون

حمید کے بچے۔ آخر پریشان کرنے سے فائدہ اور اوپر یہ تصویر اپنے..... کی بنائی ہے؟ تمہارا وہ کنوارہ مضمون کہاں گیا کہیں راستے میں کسی شادی کے خواہش مند کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو۔ بہرحال برگ گل کو رشتہ اب تک مطلوب ہے۔ فوراً۔ فوراً۔

ابن انشا

۲۴ر اگست

اے حمید! اب تُف ہے تجھ پر۔

اب سنو۔ یہ جو سرکاری پرچہ ہے نا 'پاکستان کوارٹرلی'۔ آج کل اس کی ایڈیٹر قرۃ العین حیدر ہیں۔ میں نے ان کو فون کیا تھا کہ آپ اردو کی کہانیاں ترجمہ کرا کے کیوں نہیں چھاپتیں۔ انہوں نے کہا۔ تم آج ہی کہانی منتخب کرو اور ترجمہ کرا دو۔ اس پرچے میں چلی جائے گی۔ میں نے رات کو ادب لطیف نکال کر تمہاری کہانی 'رات کا داغ' کو اس نظر سے دیکھا۔ وہ بڑے کمال کی چیز ہے۔ اس میں تمہاری سبھی خوبیاں بھرپور ملتی ہیں۔ سرکاری پرچہ ہونے کی وجہ سے اس کے بعض حصے حذف کرنے لائق تھے۔ تھوڑا سا اختصار بھی مدنظر تھا۔ لہٰذا وہ ایڈیٹنگ مجھے کرنی پڑی۔ اس پرچے کا انٹرنیشنل سرکولیشن ہے اور اس سے پہلے اس میں کچھ بہترین اردو بنگلہ کہانیوں کے ترجمے چھپ بھی چکے ہیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تمہاری کہانی جو تمہارے رنگ کی نمائندہ ہو ضرور آئے۔ بہرحال کہانی میں نے مس حیدر

کو بھجوا دی اور انہوں نے بھی بہت پسند کی۔ اب وہ مترجم کے حوالے کر دی گئی ہے۔

تم آدمی گھنّیا ہو۔ اس لیے احتیاطاً تمہیں لکھ دیا تا کہ ایسا نہ ہو کل اس کہانی کو دیکھ کر شکایت کرو کہ

کالی بلی کبوتر کھا گئی رے

اس میں سے کوئی کبوتر نہیں کھایا گیا۔ بعض پیرے۔ محض ایسے پیرے حذف کئے گئے ہیں جن سے کہانی کی اچھائی میں خلل نہیں آتا خصوصاً غیر ملکی قارئین کے نقطہ نظر سے۔ تم جیتے ہو یا مر گئے ہو۔ کچھ معلوم نہیں۔

چرکا

۹ ستمبر

پیارے منگا!

میں نے تمہیں دو خط لکھے اور تم نے کوئی جواب نہ دیا۔ تمہاری کینگی اپنی جگہ ستم لیکن بھائی آدمی آدمی دیکھ کے بات کیا کرتے ہیں۔ لاہور کے ترقی پسند دوستوں نے مجھے "بے اصول" اور "موقع پرست" اور "رجعت پسند" کہہ کر چھوڑ دیا آخر تم نے جو خود "بے اصول" "موقع پرست" اور "رجعت پسند" ہو مجھے کس لیے چھوڑا ہے۔

بس اتنا ہی کہنا تھا اور آخری بار کہنا تھا۔ اور وہ مضمون جو میں نے بھیجا تھا ابھی چھپا کیوں نہیں؟ سیدھی طرح کیوں نہیں بتاتے۔

بس اب بک بک مت کرو۔ خط لکھو۔

تمہارا

چمکا

"افکار" کراچی

۲۴ ستمبر ۱۹۵۴ء

پیارے!

شکایت کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ اگر تم افسانہ یا مضمون نہیں بھیجو گے تو تمہارا وہ خط چھاپنے کو دے دوں گا۔ اس میں جو گالیاں ہیں وہ بھی نہیں کاٹوں گا۔ تمہاری قلعی کھل جائے گی۔

بس۔ جان من:

تمہارا

چمکا

کراچی

۲۷ اکتوبر ۱۹ء

پیارے اے حمید!

معلوم ہوتا ہے تم ابن انشا کے ہاتھ سے گئے۔ وہ ابن انشا جو تمہارے دل کے اتنا قریب تھا جس کے ساتھ لارنس باغ اور بغداد کی سیریں ہوتی تھیں۔ جس نے تم سے بہت کچھ لیا تمہیں بہت کچھ دیا۔ جان من اگر یہ سچ نہیں تو تم خط کیوں نہیں لکھتے۔

تمہیں معلوم ہے یہاں مجھے تمہارے حقوق کا محافظ، تمہارا سفیر سمجھا جاتا ہے۔ تمہاری تعریف اور تمہاری برائیوں کے سلسلے میں بھی مجھے مخاطب کیا جاتا ہے۔ اور ٹھیک کیا جاتا ہے لیکن پھر میں وہی سوال پوچھوں گا کہ تم مجھے خط کیوں نہیں لکھتے۔

تم سے دو سرکاری کام ہیں۔ ایک تو یہ کہ پاک سرزمین کے لیے کوئی مزاحیہ سا مضمون لکھ دو۔ تمہارا وہ مضمون سب نے پسند کیا۔ کسی بارات کا حال۔ کسی گاؤں کی لاری کے سفر کا حال۔ کسی پچھلا سا قسم کا احوال۔ بھیجو بھیجو فوراً بھیجو۔ دوسرا پرچہ تمہیں اکتوبر کے پہلے ہفتے میں مل جائے گا۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ تخلیق کے ساتھ اپنا وعدہ پورا کرو۔ اب تک تم نے کوئی نئی چیز لکھ لی ہو گی۔ وہ دوست ہیں لہٰذا ان کو دوسرے پرچے کے لیے ضرور کچھ دینا۔ تمہاری اور میری پرسٹیج کا تقاضا ہے۔

میں تیسری بار پوچھتا ہوں کہ تم مجھے خط کیوں نہیں لکھتے۔ حفیظ کو سلام۔ وہ کیسی ہے۔

تمہارا

ابن انشا

۷ نومبر ۱۹۶۶ء

عزیز بے تمیز۔ برخوردار خباشت آثار جیتے رہو۔ یہ تم نے بڑی سعادتمندی کی کہ ہماری علالت پر فکرمندی کا اظہار کیا۔ کیونکہ اس میں کچھ نہیں لگتا۔ پلّے سے کچھ نہیں جاتا۔ اب تمہارے لکھنے کے بعد مجھے اپنی صحت کی فکر پڑ گئی ہے۔ تمہارا خط آنے سے پہلے مجھے اپنی علالت کا احساس بلکہ پتہ بھی نہ تھا۔ صحت کاملہ کے لیے اپنی دعا براہ راست اللہ میاں کو بھیجو۔ مجھے کوئی ڈاک خانہ سمجھ رکھا ہے۔ ہاں میرے گلے میں تکلیف ہے سو وہ محلے والوں کی وجہ سے ہے میں رات کو بھیرویں اور میاں کی ٹوڑی کا ریاض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ لوگ موسیقی کا ذوق کم رکھتے ہیں اور ان کے اعتراض یا منع کرنے کے انداز بھی شائستہ نہیں۔ بس اپنے شوق موسیقی کو مسلسل ضبط کرنے کی وجہ سے گلے کی رگیں اسی طرح پھول جاتی ہیں۔ جس طرح کسی افسانہ نگار یا شاعر کی تخلیق چھپ نہ سکیں تو اسے اپھارہ ہو جاتا ہے۔ میں بعض لوگوں سے عذر بھی کرتا ہوں کہ میں غرارے کر رہا تھا۔ لیکن جو لوگ سن رہیا نہیں ان کو پکّے گانوں کے رموز و اوقات اور نمک کے غراروں کے درمیان فرق کیا معلوم ؟۔

تم نے شراب چھوڑ دی ؟ کس سے پوچھ کے چھوڑی۔ ہمیشہ غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کرتے ہو۔ عواقب پر نظر نہیں رکھتے۔ بے شک شراب پینا بڑی بات ہے لیکن اسی صورت میں جب کہ اپنے پلے سے پی جائے۔ مجھے بحیثیت صحافی کے بھی تمہارا شراب چھوڑنا پسند نہیں آیا۔ اب منو بھائی کو شکایتی خط لکھوں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اخبار بھی بند ہو گیا ہو گا جس میں تم ٹھیکے سے بوتل خرید کر لیا کرتے تھے۔ بہت سے صحافی بے روزگار ہو جائیں گے۔ کیونکہ وہ

لوگ تو اخبار نکالتے اور چھاپتے ہی تمہاری ضرورت کے لیے تھے کیونکہ چھپ کر پینا مشرقی حیا کا تقاضا ہے۔ جس طرح کسی کے منہ پر سچی اور دلآزاری کی بات نہ کرنا اور فقط پیٹھ پیچھے اس کے بارے میں اعلائے کلمۃ الحق ہمارے مشرقی اخلاق کا لازمہ ہے۔

قصّہ اصل میں یہ ہے کہ مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ روزانہ مسلسل کئی کئی گھنٹے کام نہ کرنے کی وجہ سے تھکن ہو ہی جاتی ہے۔ بعض اوقات تو مہینوں بے کاری میں مصروف رہنے کی وجہ سے سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ اب میں باہر جانے والا ہوں کیونکہ اس ملک کی آب و ہوا مجھے راس نہیں آتی۔ پتہ نہیں تم دیسی لوگ کیسے یہاں رہ لیتے ہو۔

تم بے ہدایتے ہو۔ لیکن تم کو بدایتیں کرنا میرا فرض ہے۔ اور کوئی بدعادت نہ چھوڑنا۔ دوسرے جنگ کراچی میں میرا کالم بالالتزام پڑھا کرو۔ آج بھی چھپا ہے، کل بھی چھپے گا اور پھر چھپتا ہی رہے گا لیکن یہ خاص چیزیں ہیں جو میں نے ڈیکو سے بھیجیں تھیں۔ تاریخ ان اخباروں پہ ۸، اور ۹، دسمبر کی ہو گی۔ ریحانہ اور تمہاری اولاد کے لیے پیار۔

تم نے میری کتاب نہیں پڑھی صرف بچے والی نظم پڑھی ؟۔

تمہارا

ابن انشا

ابن انشا بنام اے حمید

کراچی

۳؍جون ۱۹۵۶ء

پیارے!

اس دن کے بعد تم سے ملاقات نہ ہوئی۔ اس میں میری مصروفیات اور موسم کا بہت قصور ہے لیکن تمہاری ہماری محبت کوئی ملاقاتوں کی محتاج تھوڑا ہی ہے۔ تخلیق کے ایڈیٹر خواجہ صاحب میرے دوست ہیں۔ تم تو ان سے ملے بھی تھے پرچہ اچھا نکالیں گے۔ فوراً ان کو کہانی دو۔ VPP بھیجو۔ تم نے کہانی نہ دی تو میں تمہارے پیسے جو مجھے اپنے پرچے کی طرف سے تمہیں دیتے ہیں دبا جاؤنگا۔

حفیظ کو سلام۔ اس کی صحت اچھی ہے۔ سچ جانو تم سے دوبارہ نہ ملنے اور حفیظ کی دعوت نہ کھانے کا دل ملال ہے۔

مقصود کا پتہ مجھے بھیجو۔ وہ کتابوں کے ڈیزائن بنانے کا کیا لیتا ہے۔
مجھے اس کو چینی نظموں کے بارے میں خط لکھنا ہے۔

تمہارا

ابن انشا

کراچی

۲۵؍اکتوبر

گنڈکا! میری جان۔ تمہارا خط پاکر بے حد خوشی ہوئی۔ تمہارا احسان میں ہونا اور پھر اتنی دیر رہنا میرے لئے سوہانِ روح تھا لیکن چونکہ میں تمہیں کسی متبادل ملازمت کا پتہ نہیں بتا سکتا تھا اسی لئے چپ رہتا تھا۔ احمد بشیر کی بات اور ہے۔ وہ تو کامیاب زندگی کے لئے ہر طرح کا کیریر

آزمانے کو تیار ہے گو یہ بات اسے بہت مہنگی پڑے گی۔ وہ نہ کامیاب بن سکے گا نہ خوش رہ سکے گا۔ احسان کی آب و ہوا ہی اتنی مسموم ہے کہ وہاں ترقی پسند تو درکنار کسی لبرل اور معتدل مزاج انسان کا گزر مشکل ہے۔ خیر اچھا ہوا۔ لیکن نکلے ہو یا نکالے گئے ہو۔ اگر نکالے گئے ہو تو کس پاداش میں اب کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ سب چیزیں تفصیل سے لکھو۔

پچھلے کئی دن سے تم پر پیار آرہا تھا اور تمہارا خط نہ بھی آتا تب بھی میں آج تمہیں خط ضرور لکھتا۔ دراصل بات یہ ہے کہ تم مجھے سمجھتے ہو اور میں تمہیں سمجھتا ہوں۔ میں تم سے کئی چیزیں لے سکتا ہوں اور تم مجھ سے کئی چیزیں سیکھ سکتے ہو۔ لیکن اب تو حالات ہی ایسے ہیں کہ یکجائی مشکل ہی نظر آتی ہے۔ اول تو یہاں مکان ہی میسر نہیں۔ شہر سے کوئی چار میل باہر ایک بیابان میں ایک دوست کا مہمان ہوں۔ شاید تم اس دوست کو جانتے ہو ان کا نام لوک پال سیٹھی ہے اور وہ ملٹری اکاؤنٹس میں ملازم ہیں۔ ملٹری اکاؤنٹس کے غیر شادی شدہ مہاجر ملازمین کے لئے ان کے محکمے نے ایک ہسپتال کی بیرک دے رکھی ہے۔ جس میں باقاعدہ BED ہیں۔ شمال کی طرف ہمارے بالکل سامنے ملٹری ہسپتال کی عمارت ہے اور ادھر مغرب میں جہاں سے ہو کر بس گزرتی ہے۔ SISTERS MESS ہے۔ اس لفظ ہی سے تمہارے دل میں رومانیت جاگ اٹھی ہوگی۔ لیکن میری جان اس میس میں نرسیں بہت کم نظر آتی ہیں۔ جو دو چار گزرتی ہیں ان میں سے کوئی بھی ڈھب کی نہیں ہے۔ سب کی سب حسن عسکری کے افسانوں کا کردار ہیں۔ اور پھر تم جانتے ہو۔ اپنا یہ راستہ ہی نہیں ہے۔ باقی یہ جگہ چونکہ شہر سے دور ہے اس لئے تم اسے پُرفضا کہہ سکتے ہو لیکن پُرفضا ہونے کے لئے سبزے اور روئیدگی کا ہونا ضروری ہے اور یہاں سبزے کی جگہ خاک اڑتی ہے۔

محاورے کی خاک نہیں۔ سچ مچ کی۔ بس نتیجہ یہ ہے کہ صبح آٹھ بجے اٹھتا ہوں۔ وہ اس لئے کہ نو بجے پانی بند ہو جاتا ہے۔ نہانا ضروری ہوتا ہے ورنہ بارہ بجے بھی نہ اٹھوں تو کوئی اٹھائے گا نہیں۔ خیر اس کے بعد ہسپتال کی کینٹین پر ناشتہ کر کے پھر بیرک میں آجاتا ہوں۔ اتنے میں میرے دوست دفتر چلے جاتے ہیں اور میں پھر پڑھنے لگتا ہوں۔ پڑھتے پڑھتے سو جاتا ہوں اور کوئی ایک بجے اٹھ کر شیو کرتا ہوں۔ شیو کر کے پھر کینٹین پر چلا جاتا ہوں۔ کینٹین پر روٹی تو ملتی نہیں لیکن روٹی ہی واحد چیز نہیں جس میں غذائیت ہوتی ہے ڈبل روٹی ہے۔ مکھن ہے۔ انڈے ہیں۔ جام وغیرہ میں خود لا رکھتا ہوں دودھ بھی مل جاتا ہے۔ غرضیکہ دوپہر کا کھانا کھا کر اٹھتا ہوں تو کوئی تین بجے کا وقت ہوتا ہے۔ بس سٹینڈ پر کوئی دس پندرہ منٹ انتظار کرنے پر بس مل جاتی ہے جو مجھے صدر پہنچا دیتی ہے۔

صدر کراچی کے بارونق ترین حصوں میں سے ہے۔ (شاید تم کراچی آ چکے ہو)۔ یہاں اُتر کر "کیفے جارج" میں چلا جاتا ہوں اور ڈیوٹی کے وقت تک (۳½ تک) وہاں بیٹھا رہتا ہوں۔ چائے یا لیمن یا اورنج ـــ بہرحال اچھا ہوٹل ہے۔ وہاں سے دفتر کوئی پانچ دس منٹ کا راستہ ہے چنانچہ وہاں پہنچ کر ایک ڈیڑھ گھنٹہ کام کرتا ہوں اور پہلی ڈیوٹی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر بازار کی سیر کرتا ہوں۔ پھر دہلی مسلم ہوٹل پر کھانا کھاتا ہوں۔ پھر پارس ہوٹل میں چائے پیتا ہوں اور ۷½ بجے دوسری ڈیوٹی پر آجاتا ہوں۔

دوسری ڈیوٹی نو بجے ختم ہوتی۔ اس کے بعد کوئی خاص جلدی نہیں ہوتی۔ ٹھنڈے ٹھنڈے دفتر کے دوستوں سے باتیں کرتا پھر صدر جاتا ہوں۔ وہاں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ چائے نوشی اور گپ بازی میں

گزرتا ہے۔۔ سینما اچھا ہو تو چونکہ پاس ہی ہوتا ہے وہاں چلا جاتا ہوں۔ (کافی سینما دیکھتا ہوں) ورنہ کوئی گیارہ بجے کے قریب وکٹوریا روڈ پر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں پو قدمے گھر کی راہ لیتا ہوں۔ یہاں سے گھر کوئی تین چار میل ہے اور راستہ کافی ویران سا ہے۔ بس دو نو طرف لمبے لمبے احاطوں والی اور سفیدے کے درختوں والی کوٹھیاں ہیں۔ کوئی فلیٹ یا مکان نہیں۔ کوئی دکان نہیں۔ اور اس وقت تو یعنی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب بس کوئی گزرتی ہوئی یا کوئی رکشا ہوتا ہے جو تھکا ہارا دھیمی رفتار سے مشرق سے مغرب کو یا مغرب سے مشرق کو نکل جاتا ہے۔ میری منزل کے عین درمیان میں فریئر ہال ہے۔ یہ جگہ مجھے کراچی بھر میں سب سے زیادہ پسند ہے۔ کھلا ماحول ہے آدمی کم ہوتے ہیں بنچ بچھے ہوتے ہیں۔ اور سامنے فریئر ہال کی انیسویں صدی کی عمارت ہے۔ گرجا نما۔ اور تم جانتے ہو مجھے اور تمہیں اسی کلچر اسی تہذیب اور اسی پراسرار قدامت سے محبت ہے۔ چنانچہ یہاں میں جی بھر کر بیٹھتا ہوں۔ ایک گھنٹہ۔ دو گھنٹے۔ کبھی بارہ بج جاتے ہیں کبھی ایک اور کبھی دو بجے۔ پھر سب لوگ چلے جاتے ہیں اور میں بھی ہولے ہولے گھر کی راہ لیتا ہوں۔

فریئر ہال سے گھر کوئی ڈیڑھ میل رہ جاتا ہے۔ راستے میں صرف ریلوے لائن اور کراچی چھاؤنی کا اسٹیشن آتا ہے۔ اس کے آس پاس بھی ہوٹل ہیں جو دن رات کھلے رہتے ہیں۔ اس وقت وہاں سے بھی بھیڑ چھٹ چکی ہوتی ہے۔ وہاں ایک پیالی چائے پیتا ہوں۔ اور ریلوے کے پھاٹک پر پہنچ جاتا ہوں۔ پھاٹک بند ہو یا کھلا۔ وہاں بیٹھنا ضروری ہے۔ اور جب تک ایک دو انجن ایک دو گاڑیاں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر آ جا نہ لیں طبیعت نہیں بھرتی۔ یہ کافی رومان انگیز اور روح پرور ماحول ہوتا ہے۔ ٹریفک عموماً ختم ہو چکا ہوتا ہے اور پھاٹک کا چوکیدار بھی میرے

لائن کے بالکل قریب کے جنگلے پر بیٹھنے پر معترض نہیں ہوتا۔ مجھے انجنوں سے محبت ہے خصوصاً کوئلے والے دیو ہیکل بھاری بھرکم انجنوں سے۔ اب یہ انجن تیل کے انجنوں میں تبدیل کئے جا رہے ہیں۔ ان کا سائز بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ ان سے نہ دھواں نکلتا ہے نہ شرارے جھڑتے ہیں نہ رات کو دُور سے انجن کی بھٹی میں لاٹمیں مارتی ہوئی آگ دکھائی دیتی ہے۔ غرضیکہ نہایت UNIMPRESSIVE چیز ہیں یہ انجن۔ خیر مطلب یہ کہ کوئلے کے انجن اب بہت تھوڑے دنوں کے مہمان ہیں۔ اور ان کا CHARM جاتا رہے گا۔

ریلوے لائن سے کوئی ایک میل پر گھر ہے۔ اس ایک میل کو میں جلدی جلدی طے کر کے اپنی بیرک میں پہنچ جاتا ہوں۔ وہاں میرے بستر کے قریب کا بلب رات بھر جلتا رہتا ہے۔ لوگ سو چکے ہوتے ہیں۔ میں خاموشی سے کپڑے اتار کر بستر میں دبک جاتا ہوں۔ سونے سے پہلے کتاب ضرور پڑھتا ہوں۔ عادت بن چکی ہے۔

سو یہ ہے روزمرّہ کی زندگی۔ ہفتے کو چھٹی ہوتی ہے۔ ہفتے کی شام کافی ہاؤس میں گزارتا ہوں۔ اتوار کی صبح منوڑہ جاتا ہوں کشتیوں کی سیر اچھی رہتی ہے۔ دراصل کراچی خاص سے منوڑہ جانے کے لئے کشتیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لانچ بھی مل جاتی ہے یعنی انجن والی کشتی لیکن مجھے بادبانی کشتی پسند ہے۔ دیر سے تو پہنچاتی ہے لیکن وہ کشتی کیا جس میں بادبان نہیں۔ ملاح نہیں۔ ڈوبنے کا خطرہ نہیں......

سو میرے بھائی یہ ہے آج کل کی زندگی اور مجھے اس زندگی سے کوئی شکوہ نہیں۔ ویرانے کا اُلّو واقع ہوا ہوں۔ آبادی سے یوں بھی گھبراتا ہوں۔ میرے لئے تو یہی کراچی ہے۔ میرے خیال میں یہ سب چیزیں تمہیں دلکش اور جاذب نظر لگیں گی۔ اگر ایسا ہے تو مجھے کوئی

تعجب نہ ہوگا۔

اوپر کی سطریں کل دفتر میں تمہارا خط ملنے پر لکھی تھیں اور یہ چند سطور اپنی بیرک سے لکھ رہا ہوں۔ موڈ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ چنانچہ باتیں بھی اسی طرح کی کروں گا۔ سردیاں شروع ہو چکی ہیں اور رات کو کافی سردی رہتی ہے۔ یہاں کوئٹے سے سردی کی لہر آیا کرتی ہے اور تم اخبار پڑھتے ہو تو تمہیں معلوم ہوگا۔ کہ کوئٹے میں آج کل درجہ حرارت ۱۹ ڈگری تک پہنچ جاتا ہے یعنی درجہ انجماد سے بھی ۱۳ ڈگری نیچے۔ خیر ہر چہ آید بر سرِ اولادِ آدم بگزرد مالی پریشانیوں سے یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ ڈھائی سو میں سے ایک سو اپنے پاس رکھ کر ڈیڑھ سو گھر بھیجتا ہوں اور یہاں مضامین سے اوسطاً پچاس ساٹھ روپے اور کمانے پڑتے ہیں۔ تب کہیں گزارا ہوتا ہے۔ پھر کوئی نہ کوئی خرچ سامنے رہتا ہے۔ پتلون کی سلائی۔ بوٹ۔ گرم کوٹ (کپڑا + سلائی)۔ کمبل۔ چارپائی۔ سائیکل۔ نئی عینک وغیرہ وغیرہ۔ یہاں آکر ایک سوٹ بنوایا۔ ایک سویٹر خریدا۔ کچھ قمیض پاجامے بنوائے غرضیکہ کافی خرچا ہو گیا۔ اور تو اور کتابوں کا خرچ کافی ہے۔ مثلاً اسی ایک مہینے میں اٹھارہ روپے۔ نتیجۃً پاؤں ہر وقت چادر سے نکلے رہتے ہیں۔

اور باقی اب تم سب کا حال سناؤ۔ انجمن کا کیا حال ہے۔ تمہاری تحریروں تمہارے افسانوں اور تمہارے ناولوں کا کیا حال ہے .....
احمد راہی کا کیا حال ہے۔ ملک کا کیا حال ہے۔ صفدر کا کیا حال ہے انجمن کی کانفرنس میں باہر سے کون کون لوگ آرہے ہیں۔ کانفرنس ہو کہاں رہی ہے۔ احسان میں جو مہم چل رہی ہے اس کا تو کچھ کچھ پتہ چلتا رہتا ہے۔ باقی ترقی پسندوں کے متعلق ڈاکٹر تاثیر اور عبدالسلام خورشید کا مستقل کالم بھی پڑھتا رہتا ہوں۔ نظام میں (غالباً) عبداللہ ملک کی طرف

ے تاثیر کا دندان شکن جواب بھی پڑھا ہے۔

میں نے یہاں آکر چند متفرق مضامین لکھے ہیں اور وہ میں امروز کے لیے، کیونکہ آخر رشتہ وضع وتن تو برقرار رکھنا ہُوا۔ ان میں بعض اتنے اچھے ہیں کہ میں امروز کی بجائے سویرا میں چھپوانے کو ترجیح دیتا ہوں۔ میرے نزدیک پیسہ سب سے بڑی ضرورت بن رہا ہے۔ اور سویرا نے مجھ سے جو سلوک کیا ہے وہ کافی شرمناک ہے۔ مضمون کے لیے مجھ سے ۲۵/- روپے کا وعدہ کیا گیا اور مجھ پر زور دے کر مضمون اس طرح لکھوایا گیا کہ لاہور سے کراچی آنے درمیانی آخری رات بیٹھا 'امروز' کے دفتر میں لکھتا رہا۔ تب کہیں اسٹیشن پر جب چوہدری صاحب اور راہی صاحب ملے تو مضمون ان کے حوالے کرنے کے قابل ہوا۔ اس وقت چودھری صاحب کو یاد آیا کہ وہ روپے اپنے ساتھ نہیں لائے لیکن اس میں کوئی ہرج نہیں چنانچہ انہوں نے یہاں کے ایک کتب فروش کے نام چٹ لکھ دی کہ ابن انشا صاحب میرے عزیز دوست ہیں انہیں بیس روپے میرے حساب میں سے دے دیجیے۔ میں نے ۲۵/- کی بجائے ۲۰/- کر دینے پر احتجاج کیا تو انہوں نے کہا صرف اب کے یہ لے جاؤ۔ حالات۔ فسادات.....

خیر یہاں آکر کتب فروش کے ہاں گیا۔ اس نے کہا کہ نذیر صاحب ہم سے سب کچھ وصول کر چکے ہیں۔ ان کا اب ہمارے ساتھ کوئی حساب نہیں۔ چنانچہ میں خود بھی شرمسار ہوا اور اُن کو بھی شرمسار کیا۔

اس پر ایک لفافہ راہی صاحب کو لکھا ——— جواب ندارد
یاد دہانی کے لئے ایک کارڈ لکھا ——— جواب ندارد
شرم دلانے کے لیے ایک خط لکھا ——— جواب بالکل ندارد

گلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے
کبھی بتکدے میں کروں بیاں کو کہے صنم بھی ہری ہری

۲۸ر اکتوبر کا لکھا خط آج ۹ر نومبر کو پوسٹ کر رہا ہوں۔ اس میں کچھ میرا مضمون ہے کچھ زمانے کا ہے۔

تمہارا
پچھر کا

۲۵/۵

جانِ من!

تمہارا مختصر سا ڈھائی سطری خط مل گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہارے امتحان ابھی اور بھی باقی ہیں۔ سخت بود آدمی ہو۔ پیارے تم سکالر جیسی ہو۔ عبدالحمید ادیب فاضل" بننے کی کوشش نہ کرو۔ ڈگری لے کر میں نے یا کسی اور نے کیا فیض پایا جو تم پاؤ گے۔ تمہارا تمہارا قلم ہے۔ خیر اب یہ امتحان دے ہی چکو——— سنا ہے آفاق بند رہنے کی وجہ سے تمہیں مالی پریشانیاں بھی رہیں۔ اب یہ معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہے۔ مارشل لا نے لاہور کی یعنی لاہور کے کوچہ گرد، آوارگی پیشہ گندگی پسند، قلفی نواز، چھولے خور، عاشق مزاج، آزادہ روں کی زندگی کو جو تباہ کیا ہے اس پر کچھ لکھو۔ پیارے وہ لاہور لاہور ہی تھا۔ لاہور صاف سڑکوں اور سستے دودھ دہی کا نام نہیں۔ پُرپیچ گندی گلیوں اور اونگھتے ہوئے افیمیوں کا نام ہے۔ اس کے متعلق کچھ لکھو۔ انتظار کا خط آیا تھا اُسے اس شہر کی تباہی کا بڑا غم ہے۔ تم تو لاہور کو اس سے زیادہ جانتے ہو۔ تمہارا تو اس پر ناول بن سکتا ہے۔

میرا پرچہ محض تمہاری وجہ سے رکا ہوا ہے۔ اب بہت وقت نہیں۔ ایک ہفتے میں چیز بھیج دو۔ ہماری عاشقی اور اپنی معشوقی کی شرم ہی کرو پیارے گنگا۔

تمہارا
ابنِ انشا

کراچی

جانِ من! روح و روانِ من اے حمید!

تمہارا دو سطری مجہول کارڈ کبھی کبھی مل جاتا ہے اور کبھی کبھی برنگ لفافہ بھی لیکن اس سے میرا پیٹ نہیں بھرتا۔ جی تو چاہتا ہے کہ تمہیں دل کے شیشے میں بٹھالوں۔ جس کے انتظار حسین وغیرہ کو شیشے میں پری اتارنے کا محاورہ کہیئے اور دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار کا گھٹیا شعر گنگنانے کا موقع مل سکے لیکن بس نہیں چلتا اور اس دنیائے لافانی میں کسی پر کسی کا بس نہیں چلتا۔

اب سنو ایک بات مطلب کی۔ برگِ گل کا پہلا پرچہ میرے بھائی نے تمہیں پہنچا دیا ہوگا۔ دوسرا پرچہ اچھا نکلے گا اور بازار میں بھی آئے گا۔ ممکن ہے میری ادارت میں یہ آخری پرچہ ہو کیونکہ اس کے بعد میں فارغ التحصیل ہو جاؤں گا۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ تمہارا نام کسی نہ کسی طرح اس سے ASSOCIATE ہو جائے۔ برگِ گل کے لئے تمہارا کوئی مضمون مل گیا تو یوں سمجھوں گا جیسے تمہیں گلے لگا لیا ہو۔ جیسے ہم کسی برکھا آلود شام میں لارنس کی طرف نکل گئے ہوں۔ جیسے تم میرے چینی لاک میں میرے بالکل پاس بیٹھے دنیا جہان کی حیرت انگیز باتیں کرتے ہوئے دنیا جہان کے پروگرام بنا رہے ہوں۔ اور ہاں تمہاری ایسی تصویر بھی چاہیئے جو اور کہیں نہ چھپی ہو۔ ہمارے کالج کی لڑکیوں کو تم بہت پسند ہو (مجھے اس لئے ان پر اور تم پر غصہ بھی آتا ہے) اس لئے اس فرمائش میں قارئین کرام کا پُرزور اصرار بھی شامل سمجھ لو۔ اور یہ بات دیکھ لو میں یہ نہیں چاہتا کہ تم ایسا مضمون بھیجو جو ایک بار ریڈیو پر اور چھتیس بار روزناموں میں چھپ چکا ہو۔ اگر SERIOUS راجدہ ٹائپ کہانی نہیں لکھ سکتے تو LIGHT قسم کی چیز بھیجو۔ دیکھو ضرور بھیجو

(حرامزادے تو نے داستان غریب حمزہ مجھے نہیں بھیجی۔ سالے ریڈیو کو دیتا اور تمہیں پطرس سے زیادہ درجہ دیتا۔) ــــ ورنہ میرا ارادہ ہے کہ تمہارے بعض خطوط کو شائع کر دوں۔ ایک میں عینک لگی لڑکی کا منہ چومنے کا ذکر ہے جو ناک پر رومال رکھ کر یوں کرتی ہے جیسے غسلخانہ صاف کر رہی ہو اور باقی خطوط میں تو اس سے زیادہ حرامزدگیاں ہیں۔

پس پیارے تھوڑا لکھے کو بہت جانو۔ ایک کہانی یا مضمون یا طویل خط (برائے اشاعت: ہم دونوں کی رفاقت کی یاد) مجھے بھیجدو۔ اپنی ایک یا دو تصویروں کے ساتھ۔ ایک میں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ تاکہ جب ذرا گردن جھکاؤں دیکھ لوں۔ اس لئے کہ تم پر پیار بہت آرہا ہے۔

ابنِ انشا

۲۴/۸

اے حمید! اے تُف ہے تجھ پر۔

اب سنو۔ یہ جو سرکاری پرچہ ہے نہ 'پاکستان کوارٹرلی'۔ آج کل اس کی ایڈیٹر قرۃ العین حیدر ہیں۔ میں نے ان کو فون کیا تھا کہ آپ اردو کی کہانیاں ترجمہ کرا کے کیوں نہیں چھاپتیں۔ انہوں نے کہا۔ تم آج ہی کہانی منتخب کرو اور ترجمہ کرادو۔ اسی پرچے میں چلی جائے گی۔ میں نے رات کو ادبِ لطیف نکال کر تمہاری کہانی 'رات کا داغ' کو اسی نظر سے دیکھا۔ وہ بڑے کمال کی چیز ہے۔ اس میں تمہاری بھی خوبیاں بھرپور ملتی ہیں۔ سرکاری پرچہ ہونے کی وجہ سے اس کے بعض حصے حذف کرنے کے لائق تھے۔ تھوڑا سا اختصار بھی مدنظر تھا ــ لہٰذا وہ ایڈیٹنگ مجھے کرنی پڑی۔ اس پرچے کا انٹرنیشنل سرکولیشن ہے اور اس سے پہلے اس میں کچھ بہترین اردو بنگلہ کہانیوں کے ترجمے چھپ بھی چکے

ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تمہاری کہانی۔ جو تمہارے رنگ کی نمائندہ ہو ضرور آئے۔ بہرحال کہانی میں نے مس حیدر کو بھجوا دی اور انہوں نے بھی بہت پسند کی۔ اب وہ مترجم کے حوالے کر دی گئی ہے۔

تم آدمی گھٹیا ہو۔ اس لئے احتیاطاً تمہیں لکھ دیا تاکہ ایسا نہ ہو کل اس کہانی کو دیکھ کر شکایت کرو کہ

کالی بلی کبوتر کھا گئی اے

اس میں سے کوئی کبوتر نہیں کھایا گیا۔ بعض پیرے ——— محض ایسے پیرے حذف کئے گئے ہیں جن سے کہانی کی اچھائی میں خلل نہیں آتا۔ خصوصاً غیر ملکی قارئین کے نقطہ نظر سے۔

تم جیتے ہو یا مر گئے ہو۔ کچھ معلوم نہیں۔

چڑکا

سویرا - لاہور

مائی ڈیر اے حمید!

تم مری کی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر ایسے چڑھ کے بیٹھ گئے ہو کہ ہم خاک نشینوں کی خبر ہی نہیں لیتے۔ بس بہت سیر ہو چکی۔ اب آ جاؤ۔

قرارِ خاطرِ بے تاب تھک گیا ہوں میں

ہاں ٹھیک ہے۔ تمہارا خط ملا ہے۔ لیکن خط سے کیا ہوتا ہے۔ تمہیں اب تک بنفسِ نفیس پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مثلاً آج میری نظم ہے بغداد والی۔ جسے پڑھنے کا وعدہ تم نے کیا تھا۔ اور انجمن ترقی پسند مصنفین یوم چیمپین منا رہی ہے۔ کیا یہ دن بہار کے تمہارے بغیر ہی گزریں گے۔

اور پھر افسانہ۔ اب تو سویرا بیچ بیچ آخری مراحل میں ہے چھپائی لکھائی کے۔ افسانے کے لئے طوالت کے لحاظ سے جگہ بھی تو موزوں ———

لیکن محبوب صاحب کہتے ہیں تمہارا خط آ گیا ہے اور تم نے افسانہ پوسٹ کر دیا ہے اور تم بنفسِ نفیس آ رہے ہو۔ بس بہتر معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی اس سارے لکھے پر خاک ڈالوں اور کہوں۔ لو ایک قصہ سنو۔

لیکن قصہ سنانے سے پہلے مجھے یہ خط ضرور پوسٹ کرنے دو۔

ابنِ انشا

کراچی

۲۲۔ نومبر

پیارے حمید!

تمہارا چھوٹا سا پوسٹ کارڈ ملا تھا جس میں یہ وعدہ معشوقانہ جو کبھی وفا نہ ہوا موجود تھا کہ تم مجھے جلد ہی دوسرا اور مفصل خط لکھو گے۔ وہ خط تم آج لکھتے ہو۔

در ایں اثنا نگارش میں تمہارا تغزلوں والا مضمون دیکھا۔ تمہارے ہاتھ اور تمہارا منہ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ اگر دو چار سال یہی حالت رہی تو ہم جیسے لوگوں کو تمہاری شہرت کے قطب مینار کی طرف پگڑی سنبھال کر دیکھنا پڑا کرے گا۔ چوہدری نذیر کا ذکر تو سبحان اللہ ——— تم اسے اچھے "ٹکرے" ہو۔

اب بہت خوشامد ہو چکی تمہاری اب مطلب کی بات یہ ہے کہ جلد خط لکھو ——— ورنہ میں مر جاؤں گا۔

آج کل کیا حال ہے تمہارا ——— نظام سے کیا ملتا ہے اور پلازا کے ٹکٹوں کی بلیک مارکٹ سے سگرٹ کے دام نکل جاتے ہیں یا نہیں!

یہ خط جو ملفوف ہے بصورت مضمون چھاپنا چاہو تو چھاپ لو اور آئندہ ایسے گھٹیا تنقیدی مضامین مت چھاپو۔

عارف کے بچوں کو پچکارنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

مرزا ادیب کا ذکر ذرا DAMAGING ہو گیا ہے کہ نہیں؟

تمہارا ابجڑ کا

کراچی

۷ر نومبر ۱۹۷۶ء

عزیز بے تمیز۔ برخوردار خباثت آثار۔ جیتے رہو۔ یہ تم نے بڑی سعادتمندی کی کہ ہماری علالت پر فکرمندی کا اظہار کیا کیونکہ اس میں کچھ نہیں لگتا، پلے سے کچھ نہیں جاتا۔ اب تمہارے لکھنے کے بعد مجھے اپنی صحت کی فکر پڑ گئی ہے۔ تمہارا خط آنے سے پہلے مجھے اپنی علالت کا احساس بلکہ پتہ بھی نہ تھا۔ صحت کاملہ کے لیے اپنی دعا براہ راست اللہ میاں کو بھیجو۔ مجھے کوئی ڈاکخانہ سمجھ رکھا ہے۔ ہاں میرے گلے میں تکلیف ہے۔ وہ محلے والوں کی وجہ سے ہے۔ میں رات کو بھیرویں اور میاں کی ٹوڈی کا ریاض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ لوگ موسیقی کا ذوق کم رکھتے ہیں اور ان کے اعتراض یا منع کرنے کے انداز بھی شائستہ نہیں۔ پس اپنے شوقِ موسیقی کو مسلسل ضبط کرنے کی وجہ سے گلے کی رگیں اسی طرح پھول جاتی ہیں جس طرح کسی افسانہ نگار یا شاعر کی تخلیق آپ نہ سنیں تو اسے اپھارہ ہو جاتا ہے میں بعض لوگوں سے عذر بھی کرتا ہوں کہ میں گا نہیں رہا تھا بلکہ غسلخانے میں غرارے کر رہا تھا۔ لیکن جو لوگ کن رس نہیں ان کو پکے گانوں کے رموز و اوقاف اور نمک کے غراروں کے درمیان فرق کیا معلوم؟

تو نے شراب چھوڑ دی؟ کس سے پوچھ کے چھوڑی۔ ہمیشہ غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کرتے ہو۔ عواقب پر نظر نہیں رکھتے۔ بے شک شراب پینا بُری بات ہے لیکن اسی صورت میں جب کہ اپنے پلے سے پی جائے۔ مجھے بحیثیت صحافی کے بھی تمہارا شراب چھوڑنا پسند نہیں

آیا۔ اب منو بھائی کو شکایتی خط لکھوں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اخبار بھی بند ہو گیا ہوگا جس میں تم ٹھیکے سے بوتل خرید کر پیا کرتے تھے۔ بہت سے صحافی بے روزگار ہو جائیں گے کیونکہ وہ لوگ تو اخبار نکالتے اور چھاپتے ہی تمہاری ضرورت کے لیے تھے کیونکہ چھپ کر پینا مشرقی حیا کا تقاضا ہے۔ جس طرح کسی کے منہ پر سچی اور دلآزاری کی بات نہ کرنا اور فقط پیٹھ پیچھے اس کے بارے میں اعلائے کلمۃ الحق ہمارے مشرقی اخلاق کا لازمہ ہے۔

قصہ اصل میں یہ ہے کہ مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ روزانہ مسلسل کئی کئی گھنٹے کام نہ کرنے کی وجہ سے تھکن تو ہو ہی جاتی ہے۔ بعض اوقات تو مہینوں بے کاری میں مصروف رہنے کی وجہ سے سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ اب میں باہر جانے والا ہوں کیونکہ اس ملک کی آب و ہوا مجھے راس نہیں آتی۔ پتہ نہیں تم دیسی لوگ کیسے یہاں رہ لیتے ہو۔

تم بے ہدایتے ہو لیکن تم کو ہدایتیں کرنا میرا فرض ہے۔ اور کوئی بد عادت نہ چھوڑنا۔ دوسرے جنگ کراچی میں میرا کالم بالالتزام پڑھا کرو۔ آج بھی چھپا ہے، کل بھی چھپے گا اور پھر چھپتا ہی رہے گا لیکن یہ خاص چیزیں ہیں جو میں نے ٹوکیو سے بھیجی تھیں۔ تاریخ ان اخباروں پر ۸ر اور ۹ر دسمبر کی ہو گی۔ ریحانہ اور تمہاری اولاد کے لیے پیار۔

تم نے میری کتاب نہیں پڑھی صرف بچے والی نظم پڑھی۔؟

ابن انشا

اردو کے نثری ادب کا منزل بہ منزل جائزہ

اردو نثر کی داستان

مؤلف : ــــــــ اے حمید

اردو ادب کے نثری دور کا ایک مستند جائزہ جو اردو زبان و ادب کے طلباء کے لیے ایک ٹھوس دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سلسلہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے دور سے شروع ہو کر آج تک کے حالات پر ختم ہوتا ہے۔

پہلا حصہ کا مکمل سیٹ چھپ گیا ہے۔ قیمت ۱۵۰ روپے

اردو شاعری کی پہلی کونپل بارھویں صدی عیسوی میں کوہ ہندھیاچل کی سرسبز وادیوں میں پھوٹی۔ دکن کے معروف شعراء اور بزرگان دین نے اسے پروان چڑھایا اور پھر اس کی مہک گولکنڈہ، بیجاپور، احمد نگر اور گجرات کے ساحلوں کو مشکبار کرتی ہوئی دہلی، لکھنؤ اور پنجاب کے شعری دبستانوں میں اپنے ادبی کمال کو پہنچی۔ اردو شاعری کی مکمل تاریخ :

اردو شعر کی داستان

مؤلف : اے حمید

پہلا حصہ کا مکمل سیٹ چھپ گیا ہے

قیمت : ۱۵۰ روپے

روشن کتابوں کا ایک روشن سلسلہ

مسلم شخصیات کا

انسائیکلوپیڈیا

(مشاہیر اسلام کے آئینے میں)

مؤلف :- ایم۔ ایس۔ ناز

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک اور پھر اس کے بعد مسلمان سلاطین، اولیائے کرام، مجاہدین اسلام اور علماء و ارباب الادب شخصیات کے حالات زندگی [illegible]

قیمت :- ۱۵۰ روپے

ایک اور معلوماتی انسائیکلوپیڈیا

پاکستان کے تیس سال

(ماہ جنوری سے ماہ دسمبر تک کے آئینے میں)

پاکستان کے بارے میں تیس سال کے تاریخی واقعات کا مکمل انسائیکلوپیڈیا [illegible]

قیمت :- ۱۵۰ روپے

مطبوعات شیخ غلام علی

— اردو میں پہلی مرتبہ — عظیم اور معروف و مقبول عربی کتاب کا مستند اور مکمل ترجمہ —

سیرت رسالت آب صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے اہم اور قدیم ترین ماخذ

— جسے دنیائے اسلام میں —

بارہ صدیوں سے سیرۃ طیبہ کا سب سے بڑا ذخیرہ تسلیم کیا جا رہا ہے !

سیرت النبی ؐ مرتب ابن ہشام

ترجمہ : مولانا عبدالجلیل صدیقی

نظر ثانی و تہذیب : مولانا غلام رسول مہر

جس خوبصورتی اور جامعیت کے ساتھ

حضورؐ کی سیرت مقدسہ کا نقشہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے

کسی دوسری کتاب میں نظر نہیں آتا

— اس لیے کہ —

- سیرت نبویؐ پر تمام دوسری کتابوں کا ماخذ ابن ہشام کی یہی معرکۃ آرا تصنیف ہے۔
- مصنف کا مخصوص اور دلکش اسلوب نگارش ہر بنیادی اور جزوی واقعہ کی ہو بہو تصویر سامنے لے آتا ہے۔
- جامعیت کا یہ عالم ہے کہ غزوات تک کے متعلق حتی الامکان کوئی بھی جزو نظر انداز نہیں ہوا۔

— اردو ترجمہ میں بھی —

- جامعیت کے پیش نظر تمام عربی اشعار مع ترجمہ شامل کیے گئے ہیں۔
- ابواب اور فصول اس انداز سے ترتیب دیے گئے ہیں کہ کوئی بھی چھوٹا یا بڑا واقعہ معلوم کرنے کے لیے فہرست دیکھتے ہی اس کے مقام کا پتہ چل جائے۔
- اشخاص اور مقامات کے ناموں کے صحیح تلفظ کی خاطر ان پر اعراب لگا دیے گئے ہیں۔
- حواشی میں ہر ضروری امر کی تصریح کر دی گئی ہے۔ نیز ہر مقام کا صحیح موقع اور محل بھی حواشی کے ذریعہ واضح کر دیا گیا ہے۔
- واقعات اور حالات کو پوری طرح واضح اور ذہن نشین کرانے کے لیے غزوات کے نقشے بھی جزو کتاب ہیں۔

— بڑا سائز، ضخامت ۱۶۰۰ صفحات، دو جلدیں، —

شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز، چوک انارکلی۔ لاہور

اقبالیات پر نئی کتابیں

حیاتِ اقبال — ایم۔ ایس ناز

ولادت سے رحلت تک، حکیم الامت علامہ اقبال کی زندگی کا ورق ورق، ایک نئے تحقیقی اور تخلیقی انداز میں۔

اقبال اور تحریکِ پاکستان — ایم۔ ایس ناز

حصولِ آزادی کی مکمل داستان، اقبال ایسے مفکر و سیاستدان کے خطبات، مکاتیب اور اشعار کی روشنی میں۔

اقبال کے ہم عصر — ایم۔ ایس ناز

علامہ اقبال سے ملاقاتوں کے حوالے سے نایاب تحریریں، اقبال کی کہانی، ان کے معاصرین کی زبانی۔

جوہرِ اقبال — عبدالرحمٰن طارق

علامہ اقبال کی شخصیت اور ان پر [illegible] جواہر ریزے ۔ [illegible] اسلوب، نئی آب و تاب (دوسرا ایڈیشن)۔

اقبال کا فلسفۂ سیاسیات — ڈاکٹر پرویز [illegible]

اسلامی ریاست کے زریں اصولوں اور آئین کا تفصیلی جائزہ جسے حضرت علامہ اقبال نے اپنے فلسفیانہ تفکر سے ملتِ اسلامیہ کو نئی زندگی اور روشنی بخشی۔

اقبال کا ادبی نصب العین — پروفیسر سلیم اختر

شاعرِ مشرق کے فنِ شاعری پر محققین کے مقالات، جن کی اب حیثیت مستند ہے۔

متاعِ اقبال — فضل الٰہی عارف

کلامِ اقبال کے متعدد فکری پہلو، ان کی شعری علامات اور اشارات پر ایک نفیس کتاب۔

زندہ رود — ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے والد محترم علامہ اقبال کے پس منظر میں ان کی نجی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے خیالات کے تدریجی ارتقاء کا مطالعہ [illegible] مستند [illegible] سوانح قیمت [illegible]

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

زندہ رُود ①

حیاتِ اقبالؒ کا تشکیلی دور

زندہ رُود ②

حیاتِ اقبالؒ کا وسطی دور

زندہ رُود ③

حیاتِ اقبالؒ کا اختتامی دور

سوانحِ اقبالؒ کی ترتیب کا تین جلدوں پر مشتمل یہ سلسلۂ کُتب **جاوید اقبال** کی نو برس کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ تینوں جلدیں علامہ اقبالؒ کی نجی اور فکری زندگی سے حقیقی معنوں میں شناسائی کے لیے ایک کلید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پس حیاتِ اقبالؒ کے موضوع پر اگر آپ کسی مستند تحریر کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو اس سلسلۂ کتب سے استفادہ کیجیے، کیوں کہ یہ اقبالیاتی ادب میں ایک اچھوتا اضافہ ہے!

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز

لاھور • حیدرآباد • کراچی